ایمان اور اُس کے ثمرات و مضمرات

سورۃ التغابن کی روشنی میں

نحمدہٗ ونصلی علٰی رَسولہِ الکریم ...... امَّا بَعد:

اَعُوذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ ۔ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

آج ہم اللہ کے نام سے مطالعۂ قرآن حکیم کے اس منتخب نصاب کے آٹھویں درس کا آغاز کررہے ہیں' جو اِن صفحات میں سلسلہ وار زیر اشاعت ہے۔ جیسا کہ اس سے قبل وضاحت کی جا چکی ہے' اس منتخب نصاب کا حصہ دوم مباحثِ ایمانی پر مشتمل ہے' اور اس حصہ دوم کا یہ چوتھا درس ہے جو سورۃ التغابن پر مشتمل ہے۔ یہ سورۂ مبارکہ مصحف کے اٹھائیسویں پارے میں ہے اور دو رکوعوں اور اٹھارہ آیات پر مشتمل ہے۔ سورۃ العصر کے بعد یہ پہلی مکمل سورت ہے جو اِس منتخب نصاب میں شامل ہے۔

سورت کے مضامین کا اجمالی تجزیہ

میرے مطالعے اور غور وفکر کی حد تک قرآن مجید کی چھوٹی سورتوں میں ایمان کے موضوع پر جامع ترین سورت سورۃ التغابن ہے۔ یہاں اس بات کو دوبارہ ذہن میں مستحضر کرلیجیے کہ ان مباحث میں ایمان سے مراد قانونی اور فقہی ایمان نہیں ہے جس کی بنا پر ہم اس دنیا میں ایک دوسرے کو مسلمان سمجھتے ہیں' بلکہ یہاں ایمانِ حقیقی مراد ہے جو قلبی یقین سے عبارت ہے' اور سورۃ النور کی آیاتِ نور کے مطابق یہ ایمان ایک نور ہے جس سے انسان کا باطن روشن اور منور ہو جاتا ہے اور جس کا اصل محل ومقام قلب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مصحف میں سورۃ التغابن سے متصلاً قبل سورۃ المنافقون واقع ہے' اور منافقین کے بارے میں یہ بات سب جانتے ہیں کہ وہ بھی قانوناً مسلمان شمار ہوتے تھے اور دنیا میں ان کے ساتھ بالکل مسلمانوں کا سا سلوک ہوتا تھا' اگرچہ وہ ایمانِ حقیقی سے محروم ہوتے تھے۔ یعنی وہ حقیقتاً کافر تھے۔ اس طرح قرآن مجید میں سورۃ المنافقون کے فوراً بعد سورۃ

التغابن کو لا کر گویا تصویر کے دونوں رُخوں کو یکجا کر دیا گیا' یا یوں کہہ لیجیے کہ ''تُعْرَفُ الْاَشْیَاءُ بِاَضْدَادِھَا'' کے اصول کے مطابق ''کفرِ حقیقی'' کے بالمقابل ''ایمانِ حقیقی'' کا آئینہ رکھ دیا گیا۔

سورۃ التغابن کی اٹھارہ آیات ہیں جو دو رکوعوں میں منقسم ہیں۔ یہ بڑی پیاری اور دلکش تقسیم ہے۔ پہلے رکوع کی دس آیات میں سے پہلی سات آیات میں ایمانیاتِ ثلاثہ کا ذکر ہے۔ یعنی ایمان باللہ اور صفاتِ باری تعالیٰ' ایمان بالرسالت اور ایمان بالآخرت یا ایمان بالمعاد۔ پھر اگلی تین آیات میں ایمان کی نہایت پُر زور دعوت ہے کہ یہ واقعی حقائق ہیں' ان کو قبول کرو' ان کو تسلیم کرو' انہیں حرزِ جاں بناؤ اور اِن پر یقین سے اپنے باطن کو منور کرو۔

دوسرے رکوع کی کُل آٹھ آیات ہیں۔ ان میں بھی یہی تقسیم ہے کہ پہلی پانچ آیات میں ایمان کے ثمرات اور ایمان کے نتیجے میں انسان کے فکر و نظر اور اس کی شخصیت میں جو تبدیلیاں رونما ہونی چاہئیں' ان کا بیان ہے۔ یعنی: (۱) تسلیم و رضا (۲) اطاعت و انقیاد (۳) توکل و اعتماد (۴) علائقِ دُنیوی کی فطری محبت کے پردے میں انسان کے دین و ایمان اور آخرت و عاقبت کے لیے جو بالقوۃ خطرہ مضمر ہے' اس سے متنبہ اور چوکس و چوکنا رہنا' اور (۵) مال اور اولاد کی فتنہ انگیزی سے ہوشیار و باخبر رہنا —— اور آخری تین آیات میں ایمان کے ان تقاضوں کو پورا کرنے کی نہایت زوردار اور مؤثر ترغیب و تشویق ہے' اور ان میں تقویٰ' سمع و طاعت اور انفاق فی سبیل اللہ کی اہمیت پر بہت زور دیا گیا ہے۔ اس طرح یہ سورۂ مبارکہ واضح طور پر چار حصوں میں منقسم ہے۔

ابتدائی چار آیات

اللہ تعالیٰ کی توحید اور صفاتِ کمال کا ذکر

اب آیئے اس سورۂ مبارکہ کے پہلے رکوع کے پہلے حصے کی جانب جو چار آیات پر مشتمل ہے۔ ان آیات پر کسی تفصیلی گفتگو سے قبل مناسب ہوگا کہ متن کی تلاوت کے

ساتھ ان کا ایک رواں ترجمہ ذہن نشین کرلیا جائے۔

﴿یُسَبِّحُ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ۚ لَہُ الْمُلْکُ وَلَہُ الْحَمْدُ ۫ وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ① ھُوَ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ فَمِنْکُمْ کَافِرٌ وَّمِنْکُمْ مُّؤْمِنٌ ؕ وَاللّٰہُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ② خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَصَوَّرَکُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَکُمْ ۚ وَاِلَیْہِ الْمَصِیْرُ ③ یَعْلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَیَعْلَمُ مَا تُسِرُّوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ ؕ وَاللّٰہُ عَلِیْمٌ ۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ④﴾

’’اللہ کی تسبیح بیان کرتی ہے ہر وہ شے جو آسمانوں میں ہے اور ہر وہ شے جو زمین میں ہے۔ (واقعہ یہ ہے کہ کُل کائنات کی) بادشاہی بھی اُسی کی ہے اور کُل شکر و سپاس اور تعریف وثنا کا مستحقِ حقیقی بھی صرف وہی ہے۔ مزید برآں وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ وہی ہے جس نے تم سب کو تخلیق فرمایا' لیکن تم میں سے کچھ (اس کا) انکار کرنے والے ہیں اور کچھ (اس کو) ماننے والے ہیں' اور جو کچھ تم (اس دنیا میں) کر رہے ہو اللہ اسے دیکھ رہا ہے۔ اس نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا فرمایا اور تمہاری نقشہ کشی کی اور تمہاری بہت ہی اچھی نقشہ کشی (اور صورت گری) فرمائی' اور (تمہیں) اسی کی طرف لوٹنا ہے۔ وہ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اور وہ جانتا ہے جو کچھ تم چھپاتے ہو اور جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو' اور اللہ سینوں میں پوشیدہ رازوں کا بھی جاننے والا ہے‘‘۔

جیسا کہ ترجمہ سے ظاہر ہے' ان آیاتِ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کی صفاتِ کمال کا بیان بڑے پُر جلال انداز میں ہوا ہے۔ اس موقع پر یہ اصولی بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ ایمان اصلاً ایمان باللہ کا نام ہے۔ اصولی' علمی اور نظری اعتبار سے ایمان باللہ ہی ایمان کی اصل جڑ اور بنیاد ہے۔ ایمان بالرسالت اور ایمان بالآخرت دونوں اصلاً اسی کی فروع ہیں۔ چنانچہ ایمان بِالوحیٰ' ایمان بالنبوّت' ایمان بالکتب یا فی الجملہ ایمان بالرسالت اصل میں اللہ تعالیٰ کی صفتِ ہدایت کا مظہرِ اَتم ہے۔ اسی طرح بعث بعد الموت' حشر ونشر' حساب وکتاب' جزا وسزا اور جنت و دوزخ کی تصدیق یا فی الجملہ ایمان بالآخرت یا ایمان بالمعاد اللہ تعالیٰ کی صفتِ عدل اور اس کے اسم گرامی

’’الحسیب‘‘ کا مظہرِ اَتم ہے۔ گویا اللہ حساب لینے والا ہے اور حساب کے مطابق جزا و سزا دینے والا ہے۔ اور اس کی اسی شان کا کامل ظہور آخرت میں ہوگا۔ پس معلوم ہوا کہ اصل ایمان‘ ایمان باللہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سورۃ التغابن کے پہلے رکوع میں ایمان باللہ یعنی اللہ تعالیٰ کی توحید اور صفاتِ کمال کا بیان چار آیات میں ہوا ہے‘ جبکہ ایمان بالرسالت اور ایمان بالمعاد دونوں کو تین آیات میں سمو دیا گیا ہے۔

ان ابتدائی چار آیات میں ایمان باللہ کا بیان نہایت معجز نما اسلوب میں غایت درجہ اختصار لیکن حد درجہ جامعیت کے ساتھ ہوا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ج﴾

’’اللہ کی تسبیح کرتی ہے ہر وہ شے جو آسمانوں میں ہے اور ہر وہ شے جو زمین میں ہے‘‘۔

’’تسبیح‘‘ کا معنیٰ و مفہوم

یہاں پہلے لفظ ’’تسبیح‘‘ پر غور کر لیا جائے۔ اگرچہ فوری طور پر اس کے جو عام معنی ذہن میں آتے ہیں وہ یہ اقرار ہے کہ اللہ پاک ہے۔ لیکن اس کا حقیقی مفہوم کیا ہے‘ اسے جاننا ضروری ہے۔ ’’سَبَحَ‘ يَسْبَحُ‘‘ فعل لازم ہے اور اس کا مطلب ہے کسی چیز کا تیرنا‘ خواہ وہ چیز پانی کی سطح پر تیر رہی ہو‘ خواہ فضا یا خلا میں اپنے مدار پر اپنی سطح کو برقرار رکھتے ہوئے حرکت کر رہی ہو۔ چنانچہ آپ کو قرآن مجید میں یہ الفاظ ایک سے زائد مقامات پر ملیں گے کہ: ﴿كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ﴾ (الانبیاء) ’’یہ تمام (اجرامِ سماویہ خلا میں) اپنے اپنے مدار میں تیر رہے ہیں‘‘۔ اس سے فعل متعدی بنتا ہے سَبَّحَ يُسَبِّحُ جس کا مطلب ہے کسی شے کو ’’تیرانا‘‘ یا اسے اس کی سطح پر برقرار رکھنا۔ اس کا مصدر ’’تسبیح‘‘ ہے۔ گویا لفظ تسبیح کے لغوی معنی ہیں ’’کسی کو اس کی اصل سطح پر برقرار رکھنا‘‘۔ چنانچہ اللہ کی تسبیح یہ ہے کہ اس کا جو مقامِ بلند ہے‘ اس کی جو اعلیٰ وارفع شان ہے‘ اسے اس پر برقرار رکھا جائے‘ اور اس کی ذاتِ اقدس‘ صفاتِ اکمل اور شانِ ارفع کے ساتھ کوئی ایسا تصور شامل نہ کیا جائے جو اس کے شایانِ شان نہ ہو۔ گویا کسی بھی درجے کے ضعف‘ عجز‘ نقص‘

عیب یا محدودیت کا کوئی بھی تصور اُس کی ذات وصفات کے ساتھ شامل کرنے کے معنی یہ ہیں کہ انسان اسے اس کے مقامِ رفیع سے نیچے گرا رہا ہے۔ معاذ اللہ! ـــــ پس تسبیح باری تعالیٰ کا مفہوم یہ ہوگا کہ اس بات کا اقرار واعتراف کیا جائے کہ اللہ ہر عیب سے، ہر نقص سے، ہر ضعف سے، ہر احتیاج سے منزہ و ماوراء اور اعلیٰ وارفع ہے، گویا فی الجملہ ''اللہ پاک ہے''۔ واضح رہے کہ یہ معرفتِ الٰہی کا سلبی پہلو ہے کہ ہم نے یہ جان لیا کہ اللہ میں کوئی نقص نہیں، کوئی عیب نہیں، اسے کوئی احتیاج نہیں۔ وہ ان سب سے منزہ اور پاک ہے۔ معرفتِ الٰہی کے مثبت پہلو کا بیان ''وَلَهُ الْحَمْدُ'' کے الفاظ میں آئے گا جو آگے آرہے ہیں!

اب قابلِ غور امر یہ ہے کہ کائنات کی ہر شے کس معنی ومفہوم میں اللہ کی تسبیح کر رہی ہے! یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو کوئی زبان دی ہو۔ جیسے کہ ہم جانتے ہیں کہ پرندوں کی بھی زبان ہے اور ان کی اپنی اپنی بولیاں ہیں۔ اسی طرح شجر وحجر میں بھی حس موجود ہے اور کوئی عجب نہیں کہ وہ بھی آپس میں مبادلۂ احساس کرتے ہوں۔ چیونٹی جیسی حقیر مخلوق کی گفتگو کا ذکر سورۃ النمل میں موجود ہے: ﴿قَالَتْ نَمْلَةٌ يّٰاَيُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسٰكِنَكُمْ ۚ﴾ (آیت ۱۸) ''ایک چیونٹی نے کہا کہ اے چیونٹیو! اپنے بلوں میں گھس جاؤ''۔ لہٰذا یہ بات بعید از قیاس نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر شے کو کوئی زبان عطا کی ہو، کیونکہ قرآن مجید میں ایک مقام پر یہ الفاظ بھی وارد ہوئے ہیں: ﴿اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِىْٓ اَنْطَقَ كُلَّ شَىْءٍ﴾ (حٰمٓ السجدة: ۲۱) ''(قیامت میں انسان کے اعضاء کہیں گے کہ) اُس اللہ نے ہمیں بھی گویائی عطا فرمادی ہے جس نے ہر شے کو گویائی بخشی''۔ میدانِ حشر میں انسان کے اعضاء جب اس کے خلاف گواہی دیں گے تو انسان پکار اٹھے گا کہ تم ہمارے جسم کا حصہ ہوتے ہوئے ہمارے خلاف گواہی کیوں دے رہے ہو؟ تو وہ جواب میں مذکورہ بالا بات کہیں گے۔ لیکن ظاہر بات ہے کہ کائنات کی ہر شے جو تسبیح لسانی کر رہی ہے وہ ہمارے فہم سے ماوراء ہے۔ چنانچہ سورۂ بنی اسراءیل میں ارشاد فرمایا:

﴿تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ۭ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا

یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰکِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِیْحَهُمْ ﴾ (آیت ۴۴)

''اُس (اللہ) کی تسبیح تو ساتوں آسمان اور زمین اور وہ ساری چیزیں کر رہی ہیں جو آسمانوں اور زمین میں ہیں۔ اور کوئی شے ایسی نہیں ہے جو اُس کی تحمید کے ساتھ تسبیح نہ کر رہی ہو' لیکن تم ان کی تسبیح کو سمجھ نہیں سکتے''۔

البتہ اس کائناتی اور آفاقی تسبیح کا ایک پہلو ایسا بھی ہے جو ہماری سمجھ میں آتا ہے جسے تسبیحِ حالی قرار دینا مناسب ہوگا۔ یعنی یہ کہ ہر شے اپنے وجود سے اعلان کر رہی ہے' گویا زبانِ حال سے اس بات کی گواہی دے رہی ہے کہ میرا خالق' میرا مالک' میرا صانع' میرا مصوّر' میرا موجد' اور میرا مدبّر ایک ایسی ہستی ہے جو کامل ہے' جس کے نہ علم میں کوئی کمی ہے' نہ قدرت میں کوئی کمی ہے اور نہ حکمت میں کوئی کمی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اگر کوئی تصویر نہایت اعلیٰ ہے' فنِ مصوری کا شہ پارہ ہے تو درحقیقت وہ تصویر اپنے وجود سے اپنے مصور کے کمالِ فن کو ظاہر کرتی ہے۔ تخلیق اگر کامل ہے تو اس سے اس کے خالق کا کمال ظاہر ہو رہا ہے۔ لہٰذا یہ کُل کائنات' یہ جملہ مصنوعات اور یہ تمام مخلوقات اللہ تعالیٰ کی صفتِ تخلیق کے حد درجہ اکمل و اَتم اور صفتِ ''تصویر'' یعنی صورت گری کے نہایت حسین و جمیل مظاہر ہیں۔ سورۃ الحشر کی آخری تین آیاتِ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ کے سولہ اسمائے حسنیٰ آئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ کا ایسا حسین اور اتنا عظیم گلدستہ کسی اور مقام پر نہیں آیا ہے۔ ان سولہ اسمائے حسنیٰ میں سے تین الخالق' الباری اور المصور ہیں۔ یعنی اللہ تخلیق کی منصوبہ بندی فرمانے والا ہے' اس کو خارج میں ظاہر فرمانے والا ہے' اور اس کی آخری صورت گری اور نقشہ کشی کرنے والا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ کُل کائنات اور کُل موجودات کا الخالق' الباری اور المصور اللہ سبحانہ کی ذاتِ اقدس ہے۔ اور یہ تخلیق و تصویر کامل ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے سورۃ الملک میں چیلنج کے انداز میں ارشاد فرمایا:

﴿مَا تَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ؕ فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرٰی مِنْ فُطُوْرٍ ۝۳ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ کَرَّتَیْنِ یَنْقَلِبْ اِلَیْکَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِیْرٌ ۝۴﴾

''تم رحمٰن کی تخلیق میں کوئی نقص تلاش نہ کر سکو گے۔ ذرا (چاروں طرف) نظر

دوڑاؤ‘ کیا تمہیں کوئی رخنہ نظر آتا ہے؟ بار بار نگاہ دوڑاؤ‘ تمہاری نگاہ ناکام اور تھک ہار کر لوٹ آئے گی (اور تم ہماری اس تخلیق میں کوئی نقص وعیب نہ نکال سکو گے)۔“

تو سوچو کہ عیب ونقص سے مبرا ومنزہ کون ہے؟ وہ ہستی کہ جس نے ان سب کی تخلیق فرمائی اور جو اِس پوری کائنات کی خالق ومصور بھی ہے اور محافظ ومدبر بھی! الغرض یہ ہیں معانی و مفاہیم ﴿یُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ج﴾ کے!

لَہُ الْمُلْکُ وَلَہُ الْحَمْدُ کا مفہوم

اسی آیت مبارکہ میں آگے ارشاد فرمایا: ﴿لَہُ الْمُلْکُ﴾ ”بادشاہی اُسی کی ہے“۔ یعنی اس پوری کائنات کا حقیقی حکمران وہی ہے۔ بقول علامہ اقبال مرحوم: ؎

سروری زیبا فقط اُس ذاتِ بے ہمتا کو ہے

حکمراں ہے اِک وہی باقی بتانِ آزری!

وہ قانوناً (*de jure*) بھی اس پوری کائنات کا بلا شرکتِ غیرے بادشاہ ہے۔ یعنی حکمرانی کا استحقاق بھی صرف اُسی کو حاصل ہے اور واقعتاً (*de facto*) بھی بادشاہی اُسی کی ہے۔ یعنی فی الواقع بھی بادشاہِ حقیقی اور حاکمِ مطلق صرف اسی کی ذات ہے۔ گویا ”لَہٗ“ میں حرفِ جار ”لام“ لامِ استحقاق کے معنی بھی دے رہا ہے اور لامِ تملیک کے بھی۔ اگر صحیح نہج پر غور کیا جائے تو اس لازمی نتیجے تک پہنچے بغیر چارہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جن مخلوقات کو کچھ اختیار بخشا ہے‘ جیسے جِن واِنس‘ ان کا اپنا پورا وجود بھی اللہ کے قانون میں جکڑا ہوا ہے۔ چنانچہ ہم اس بات پر قادر نہیں ہیں کہ اپنے جسم کے کسی حصے پر بالوں کی روئیدگی کو روک سکیں۔ ہمیں یہ اختیار حاصل نہیں ہے کہ جب چاہیں اپنے قلب کی حرکت کو روک دیں اور جب چاہیں اسے رواں کر دیں۔ اسی طرح ہم آنکھ سے سننے کا کام نہیں لے سکتے اور کان سے دیکھنے کا کام نہیں لے سکتے۔ معلوم ہوا کہ ہمارا اپنا وجود بھی ہمارے حکم کے تابع نہیں ہے‘ بلکہ اللہ تعالیٰ کے قوانینِ تکوینی وطبعی میں جکڑا ہوا ہے۔ گویا وہ بھی اسی بادشاہِ حقیقی کا حکم مان رہا ہے‘ جس کے لیے نہایت ایجاز واعجاز کے ساتھ فرمایا

گیا ہے : ﴿لَهُ الْمُلْكُ﴾ ’’حقیقی بادشاہی صرف اسی کی ہے‘‘۔ یہ دوسری بات ہے کہ اپنے وجود کے ایک نہایت محدود اور حقیر سے حصے میں اختیار اور ارادے کی اس آزادی پر‘ جو تمام تر اللہ ہی کی عطا کردہ ہے‘ ہم اتنے از خود رفتہ ہو جائیں کہ اردو ضرب المثل کے مطابق ہلدی کی گانٹھ پا کر پنساری بن بیٹھیں اور اپنے آپ کو کلیتاً خود مختار سمجھنے لگیں!

آگے ارشاد فرمایا: ﴿وَلَهُ الْحَمْدُ﴾ ’’اور کُل حمد بھی اُسی کے لیے ہے‘‘۔ لفظ ’’حمد‘‘ (جس کی تشریح اس سے قبل سورۃ الفاتحہ کے درس میں بیان ہو چکی ہے) مجموعہ ہے شکر و ثنا دونوں کا۔ گویا کُل شکر اسی کے لیے ہے اور کُل ثنا بھی اُسی کے لیے ہے۔ اس لیے کہ اس پورے سلسلۂ کون و مکاں میں جہاں کہیں کوئی خیر و خوبی‘ کوئی حسن و جمال اور کوئی مظہرِ کمال نظر آ رہا ہے اس کا سرچشمہ و منبع اللہ تعالیٰ ہی کی ذاتِ والا صفات ہے۔ لہٰذا تعریف کا حقیقی مستوجب و سزاوار اور مالک و مستحق بھی صرف وہی ہے۔ اسی طرح چونکہ ہمیں جو کچھ بھی حاصل ہو رہا ہے اور ہماری جو ضرورت بھی پوری ہو رہی ہے وہ چاہے بہت ہی طویل سلسلۂ اسباب کے تعلق و توسط سے ہو رہی ہو‘ لیکن اصل مسبّب الاسباب تو بہر حال اللہ تعالیٰ ہی ہے‘ لہٰذا شکر کی حقیقی مستحق بھی صرف اُسی کی ذات ہے۔

اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کا تصور

آگے ارشاد فرمایا: ﴿وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ①﴾ ’’اور وہ ہر چیز پر قادر ہے‘‘۔ اُس کے قبضۂ قدرت اور اختیار و اقتدار سے کوئی چیز باہر نہیں ہے! یہاں پہلی آیت ختم ہوئی۔ اس سے قبل ایک درس میں عرض کیا جا چکا ہے کہ معرفتِ الٰہی کے ضمن میں جہاں تک ذاتِ باری تعالیٰ کا تعلق ہے تو وہ ہمارے فہم و ادراک ہی نہیں ہماری قوتِ متخیلہ سے بھی وراء الوراء ثم وراء الوراء ہے۔ چنانچہ ہمارا اللہ تعالیٰ کو جاننا اور پہچاننا کُل کا کُل اس کی صفات کے حوالے سے ہے‘ اور ان کے ضمن میں بھی ہمارے فہم و شعور کا دائرہ بہت ہی محدود ہے۔ یعنی ہم یہ تو جانتے ہیں کہ اللہ سمیع ہے‘ بصیر ہے اور کلام فرماتا ہے‘ لیکن یہ نہیں جان سکتے کہ وہ کیسے سنتا ہے‘ کیسے دیکھتا ہے اور کیسے کلام کرتا ہے۔ اسی طرح ہم یہ تو جانتے ہیں کہ وہ علیم ہے‘ قدیر ہے اور حکیم ہے‘ لیکن ہم اس کا کوئی تصور تک نہیں کر

سکتے کہ وہ کتنا علیم ہے‘ کتنا قدیر ہے اور کس قدر حکیم ہے۔ گویا صفاتِ باری تعالیٰ کے یہ مختلف پہلو بھی ہمارے ذہن و شعور اور فہم و ادراک سے ماوراء ہیں‘ اور ہمارے ذہن کے چھوٹے سے سانچے میں‘ جو نہایت محدود ہے‘ اللہ تبارک وتعالیٰ کی صفاتِ مطلقہ اپنی پوری شان کے ساتھ سما ہی نہیں سکتیں۔ لہٰذا ہمارے لیے واحد پناہ گاہ ایک لفظ ”کُل“ ہے۔ جیسے ﴿وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ﴾ (وہ ہر چیز پر قادر ہے) جس پر یہ پہلی آیتِ مبارکہ ختم ہو رہی ہے‘ اور ﴿وَهُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ﴾ (اور وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے) جس پر اس سورۂ مبارکہ کا پہلا رکوع ختم ہوتا ہے! — ہر صاحبِ ذوق اندازہ کر سکتا ہے کہ ان دونوں مقامات پر اصل زور لفظ ”کُلّ“ پر ہے۔

ایمان و کفر کی بحث

دوسری آیت کے آغاز میں فرمایا: ﴿هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ﴾ ”وہ (اللہ) ہی ہے جس نے تم سب کو پیدا فرمایا“۔ گویا پہلی آیت ایک پُر جلال تمہید کی حیثیت رکھتی ہے جس کے بعد ایمان اور کفر کی بحث شروع ہو رہی ہے‘ جس کے لیے نہایت فصیح و بلیغ اور حد درجہ لطیف پیرایۂ بیان اختیار فرمایا کہ ذرا غور کرو کہ اللہ تعالیٰ ہی کی ذاتِ والا صفات ہے جو تم سب کی خالق ہے۔ گوروں کو بھی اُسی نے پیدا کیا اور کالوں کو بھی‘ مشرق کے رہنے والوں کو بھی اور مغرب کے رہنے والوں کو بھی — تو پھر کتنی حیرت کی بات ہے کہ: ﴿فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ ؕ﴾ ”تو تم میں سے کوئی کافر ہے اور کوئی مؤمن!“ حالانکہ اُس نے ارادے اور اختیار کی جو تھوڑی سی آزادی تمہیں عطا فرمائی ہے وہ اصلاً ابتلاء و آزمائش اور امتحان کے لیے ہے۔ جیسا کہ سورۃ الملک میں ارشاد ہوا: ﴿الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوةَ لِیَبْلُوَكُمْ اَیُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ﴾ (آیت۲) ”(اللہ ہی ہے) جس نے موت و حیات (کے سلسلے) کو پیدا فرمایا تاکہ تم لوگوں کو آزمائے کہ کون ہے تم میں سے بہتر عمل کرنے والا“۔ یہی بات سورۃ الدھر میں اس اسلوب سے ارشاد ہوئی: ﴿اِنَّا هَدَیْنٰهُ السَّبِیْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا ۝۳﴾ ”یقیناً ہم نے اس (انسان) کو (ہدایت کا) راستہ دکھا دیا‘ اب وہ (مختار ہے) خواہ شکر گزار بندہ بنے‘ خواہ ناشکرا اور

انکار کرنے والا بن جائے!‘‘ ——اسی اختیار کا ظہور اس طرح ہو رہا ہے کہ کچھ لوگ اللہ کا کفر کرنے والے ہیں اور کچھ لوگ اس کو ماننے والے ہیں‘ لیکن ظاہر بات ہے کہ انسان کا رویہ اور اس کی روش بے نتیجہ نہیں رہے گی‘ بلکہ اس کا بھلا یا برا نتیجہ نکل کر رہے گا۔ لہٰذا اس آیت کے اختتام پر انسان کو مطلع اور خبردار کر دیا گیا کہ: ﴿وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ﴾ ’’اور جو کچھ تم کر رہے ہو اسے اللہ تعالیٰ دیکھ رہا ہے‘‘۔ اس ارشاد میں بیک وقت ایک دھمکی بھی مضمر ہے اور ایک بشارت بھی۔ یعنی جو لوگ اس کے منکر‘ باغی اور سرکش ہوں گے‘ گویا ناشکرے ہوں گے‘ اور جو اس کے ساتھ شرک کریں گے ان کو وہ سزا دے گا۔ یہ ان الفاظِ مبارکہ کا دھمکی والا پہلو ہے۔ اور بشارت والا پہلو یہ ہے کہ جو اس کے شکر گزار ہوں گے‘ اس کے مطیع و فرماں بردار ہوں گے اور اس کی معرفت سے اپنے قلوب و اذہان کو منور کریں گے ان کو وہ انعام و اکرام سے نوازے گا۔ اس لیے کہ وہ سب کچھ دیکھ رہا ہے اور سب کی روش سے آگاہ ہے!

کائنات اور انسان کی بامقصد تخلیق

اگلی آیت میں ارشاد فرمایا: ﴿خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ﴾ ’’اُس نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا فرمایا‘‘۔ یعنی اللہ نے یہ ساتوں آسمان اور یہ زمین جو پیدا فرمائے ہیں تو بے کار و بے مقصد اور بلا غرض و غایت پیدا نہیں فرمائے‘ بلکہ ’’بالحق‘‘ پیدا فرمائے ہیں‘ یعنی ایک مقصد کے ساتھ ان کی تخلیق فرمائی ہے۔ ’’حق‘‘ عربی زبان کا بڑا وسیع المفہوم لفظ ہے۔ اس کا اصل مفہوم ہے ’’وہ چیز جو فی الواقع موجود ہو‘‘۔ باطل کا لفظ حق کی ضد ہے‘ چنانچہ باطل اصلاً اس کو کہتے ہیں کہ جو نظر تو آئے‘ محسوس و مشہود تو ہو‘ لیکن حقیقتاً موجود نہ ہو‘ جیسے سراب۔ لیکن حق کے اس مفہومِ اصلی پر چند مفاہیم زائد ہیں۔ مثلاً حق ہر وہ چیز ہے جو عقلاً مسلّم ہو‘ اس کے مقابلہ میں باطل وہ چیز ہے جو عقلاً مسلّم نہ ہو۔ اسی طرح حق ہر وہ شے ہے جو اخلاقاً ثابت ہو اور اس کے مقابلہ میں باطل وہ ہے جو اخلاقاً ثابت نہ ہو۔ مزید برآں حق ہر وہ چیز ہے جو بامقصد ہو‘ جس کے پیچھے کوئی حکمت کارفرما ہو اور اس کے مقابلہ میں باطل و عبث ہر وہ فعل ہے جو بے مقصد

ہواور جس کی پشت پر کوئی حکمت نہ ہو۔ اس آیت میں لفظ ''حق'' اسی آخری مفہوم میں استعمال ہوا ہے اور کلام کا حاصل اور مدعا یہ ہے کہ اللہ نے یہ کائنات بے مقصد اور بغیر حکمت کے گویا باطل اور عبث نہیں بنائی۔ یہ مضمون سورۂ آل عمران کے آخری رکوع میں بھی بایں الفاظ آ چکا ہے: ﴿رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًاۚ﴾ (آیت ۱۹۱) ''اے ربّ ہمارے! تو نے یہ سب کچھ باطل و بے مقصد نہیں بنایا!''

کائنات کی عمومی تخلیق کے ذکر کے بعد خاص طور پر تخلیقِ انسانی کا ذکر فرمایا گیا: ﴿وَصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْۚ﴾ ''اور (اس نے) تمہاری نقشہ کشی کی اور تمہاری بہت ہی اچھی نقشہ کشی اور صورت گری فرمائی''۔ یعنی ذرا اپنی عظمت کو پہچانو، تم اس کُل سلسلۂ تخلیق کا نقطۂ عروج ہو، اللہ نے تمہیں اشرف المخلوقات بنایا اور تمہیں کیسی کیسی عمدہ و اعلیٰ اور ظاہری و باطنی استعدادات سے نوازا۔ اس نے تمہاری تخلیق ''فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ'' یعنی ''نہایت اعلیٰ اور بہترین انداز'' پر کی۔ پھر تمہاری صورت گری کی اور ناک نقشہ عطا فرمایا اور کیا ہی عمدہ شکل وصورت سے نوازا۔ تو کیا یہ سب کچھ بے کار اور بے مقصد ہے؟ اور کیا ''نشستند، گفتند و برخاستند'' کے مانند تمہارا اس دنیا میں پیدا ہونا اور حیوانوں کی طرح پیٹ اور جنس کے تقاضے پورے کر کے مر جانا ہی تمہاری کُل حقیقت ہے؟ نہیں، ایسا نہیں ہے، بلکہ: ﴿وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ۝۳﴾ ''اور اسی کی طرف (سب کو) لوٹنا ہے''۔ اور ظاہر ہے کہ لوٹنا جواب دہی کے لیے ہوگا۔ وہاں تمہارا محاسبہ ہوگا۔ تم محض حیوان نہیں ہو، تمہارا مرتبہ ومقام بہت بلند ہے، تم اشرف المخلوقات ہو۔ لہٰذا ع

''جن کے رتبے ہیں سوا اُن کی سوا مشکل ہے!''

کے مصداق تمہاری ذمہ داری بھی بہت زیادہ ہے اور تمہیں لازماً جواب دہی کرنی ہوگی۔

یہاں آپ نے دیکھا کہ مضمون تدریجاً ایمان باللہ سے ایمان بالآخرۃ کی طرف منتقل ہو گیا۔ قرآن حکیم میں اس مضمون کی دوسری نہایت حسین نظیر سورۃ المؤمنون کے آخر میں ہے کہ: ﴿اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ۝۱۱۵﴾ ''کیا تم نے یہ گمان کیا ہے کہ ہم نے تمہیں عبث پیدا کیا ہے اور تم ہماری طرف لوٹائے نہ جاؤ گے؟''

صفتِ علم کے تین اَبعاد

چوتھی آیت میں اللہ تعالیٰ کی صفاتِ کمال کے ضمن میں صفتِ علم کا ذکر ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کی جن دو صفات پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے وہ صفتِ قدرت اور صفتِ علم ہیں۔ چنانچہ ﴿وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾ اور ﴿وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ﴾ کے الفاظ قرآن حکیم میں بتکرار و اعادہ وارد ہوئے ہیں۔ ان میں سے صفتِ علم کے بیان میں سورۃ التغابن کی یہ چوتھی آیت اس اعتبار سے بڑی منفرد ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی صفتِ علم کو تین مختلف اسالیب سے بیان کیا گیا ہے' یا یوں کہہ لیجیے کہ ہماری تفہیم کے لیے اس مقام پر اللہ کے علم کے تین اَبعاد (dimensions) کو نمایاں کیا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ ''وہ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے''۔ اب آپ غور کیجیے کہ بات مکمل ہو گئی' اس لیے کہ ''آسمانوں اور زمین'' سے مراد کُل کائنات ہے اور اس کے علم میں ہر شے کا علم شامل ہے' لیکن اس پر مزید اضافہ فرمایا: ﴿وَيَعْلَمُ مَا تُسِرُّوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ ؕ﴾ ''اور وہ جانتا ہے جو کچھ تم چھپاتے ہو (یا چھپا کر کرتے ہو) اور جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو (یا اعلانیہ کرتے ہو)''۔ یہ ایک دوسرے رُخ سے اللہ کے احاطۂ علمی کا بیان ہو گیا۔ لیکن پھر مزید تاکید اور زور کے لیے فرمایا: ﴿وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝﴾ ''اور اللہ تعالیٰ دلوں کا حال تک جانتا ہے''۔ جو کچھ تمہارے سینوں میں مخفی ہے اور تمہارے تحت الشعور میں مضمر ہے وہ سب بھی اللہ تعالیٰ پر عیاں ہے اور اللہ اس کا بھی جاننے والا ہے۔ ان الفاظِ مبارکہ میں اللہ کے احاطۂ علمی کے ایک تیسرے عرض کی جانب اشارہ ہے' اس لیے کہ بعض چیزیں تو وہ ہوتی ہیں جنہیں انسان جان بوجھ کر گویا شعوری ارادے کے ساتھ چھپاتا ہے' ان کا ذکر تو آیت کے دوسرے حصے میں ہو گیا۔ اور بعض چیزیں وہ ہیں جو انسان کے تحت الشعور میں مؤثر اور محرک عوامل کی حیثیت سے کارفرما ہوتی ہیں' اگرچہ انسان کو خود اُن کا شعور نہیں ہوتا۔ آیت کے تیسرے اور آخری حصے میں ان کا بھی احاطہ کر لیا گیا کہ تمہارے وہ اصل محرکاتِ عمل جن کا خود تمہیں شعور حاصل نہیں ہوتا' اللہ ان سے بھی باخبر

ہے' اور یہ سب اصلاً شرح ہے ﴿وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ﴾ کی! اس چوتھی آیت پر اللہ تعالیٰ کی توحید اور صفاتِ کمال کا بیان ختم ہوتا ہے۔

آغازِ درس میں اس سورۂ مبارکہ کا ایک تجزیہ پیش کیا جا چکا ہے کہ اس کی پہلی سات آیات میں ایمانیاتِ ثلاثہ یعنی ایمان باللہ' ایمان بالرسالت اور ایمان بالآخرت کا ذکر ہے اور اس کے بعد تین آیات میں ایمان کی پُر زور دعوت ہے۔ پہلے رکوع کی ان دس آیات میں سے چار آیات کا ہم مطالعہ کر چکے ہیں' اور اب ہم بقیہ چھ آیات کا مطالعہ کرتے ہیں۔ لہٰذا پہلے ہم ان کا سلیس و رواں ترجمہ ذہن نشین کر لیں:

﴿اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَبَؤُا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ ۡ فَذَاقُوْا وَبَالَ اَمْرِهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ۝۵ ذٰلِكَ بِاَنَّهٗ كَانَتْ تَّاْتِيْهِمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَقَالُوْا اَبَشَرٌ يَّهْدُوْنَنَا ۡ فَكَفَرُوْا وَتَوَلَّوْا وَّاسْتَغْنَى اللّٰهُ ۭ وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ۝۶ زَعَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اَنْ لَّنْ يُّبْعَثُوْا ۭ قُلْ بَلٰى وَرَبِّيْ لَتُبْعَثُنَّ ثُمَّ لَتُنَبَّؤُنَّ بِمَا عَمِلْتُمْ ۭ وَذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ۝۷ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالنُّوْرِ الَّذِيْٓ اَنْزَلْنَا ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ۝۸ يَوْمَ يَجْمَعُكُمْ لِيَوْمِ الْجَمْعِ ذٰلِكَ يَوْمُ التَّغَابُنِ ۭ وَمَنْ يُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ وَيَعْمَلْ صَالِحًا يُّكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّاٰتِهٖ وَيُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ۝۹ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ۝۱۰﴾

''کیا نہیں پہنچ چکی ہے تمہیں خبر ان لوگوں کی جنہوں نے کفر کی روش اختیار کی تھی (تم سے) پہلے؟ تو وہ چکھ چکے اپنے کیے کی سزا اور ان کے لیے (آخرت کا) دردناک عذاب (مزید) ہے۔ یہ اس لیے ہوا کہ ان کے پاس ان کے رسول واضح اور روشن تعلیمات کے ساتھ آتے رہے تو انہوں نے کہا کہ کیا انسان ہمیں ہدایت دیں گے؟ پس انہوں نے کفر کیا اور پیٹھ موڑ لی تو اللہ نے بھی استغناء اختیار فرمایا' اور اللہ تو ہے ہی غنی اور (اپنی ذات میں ازخود) محمود۔ کافروں کو یہ مغالطہ لاحق ہو گیا ہے کہ انہیں (موت کے بعد) اٹھایا نہ جائے گا۔ (اے نبی ﷺ!) کہہ دیجیے: کیوں نہیں! اور مجھے میرے ربّ کی قسم ہے کہ تمہیں لازماً

اٹھایا جائے گا‘ پھر تم کو جتلایا جائے گا جو کچھ تم کرتے رہے تھے۔ اور یہ چیز اللہ پر بہت آسان ہے۔ پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسولؐ پر اور اُس نور پر جو ہم نے نازل فرمایا (یعنی قرآن مجید)۔ اور جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔ جس دن وہ تم کو جمع کرے گا جمع ہونے کے دن (یعنی قیامت کے دن) وہ ہوگا (اصل) ہار اور جیت کے فیصلے کا دن۔ اور جو ایمان لائے گا اللہ پر اور نیک عمل کرے گا تو وہ اس سے اس کی برائیوں کو دور کر دے گا اور اسے داخل کرے گا ان باغات میں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی‘ وہ اس میں رہیں گے ہمیشہ ہمیش۔ یہی ہے بہت بڑی کامیابی۔ اور وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا ہوگا اور ہماری آیات کو جھٹلایا ہوگا وہ ہوں گے آگ والے‘ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ اور وہ بہت ہی برا ٹھکانہ ہے‘‘۔

آیاتِ مبارکہ اور ان کے ترجمہ سے یہ بات سامنے آجاتی ہے کہ یہاں اوّلاً ایمان بالرسالت اور ایمان بالآخرت کا بیان نہایت ہی مؤثر اسلوب اور حد درجہ فصاحت و بلاغت سے ہوا ہے۔ اس اندازِ کلام کے اعجاز سے ہر وہ شخص لطف لے سکتا ہے جو عربی زبان کی تھوڑی سی بھی شُد بُد رکھتا ہو۔

دو آیات میں ایمان بالرسالت کا بیان

پہلے ایمان بالرسالت کے ضمن میں یہ عظیم حقیقت واضح کی جارہی ہے کہ رسولوں کا معاملہ عام واعظین‘ ناصحین‘ مصلحین یا مبلغین کا سا نہیں ہے کہ چاہے لوگ ان کی بات مانیں چاہے نہ مانیں کوئی اہم فرق واقع نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس رسول تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آخری حجت بن کر آتے ہیں۔ لہٰذا ان کے انکار‘ ان سے اعراض اور ان کی تکذیب کے دو نتیجے نکل کر رہتے ہیں اور ان کا انکار کرنے والوں کو دو سزائیں مل کر رہتی ہیں۔ ایک اس دنیا میں عذابِ استیصال جس کے ذریعے پوری پوری قومیں ہلاک و برباد کر دی گئیں‘ جیسے قومِ نوحؑ‘ قومِ ہودؑ‘ قومِ صالحؑ‘ قومِ لوطؑ‘ قومِ شعیبؑ اور آلِ فرعون۔ ان قوموں کا ذکر قرآن مجید میں بار بار اسی اعتبار سے آیا ہے کہ ان کے پاس اللہ کے رسول ایسی واضح تعلیمات کے ساتھ آئے جو فطرتِ انسانی کے لیے جانی پہچانی تھیں۔

مزید برآں یہ رسول کھلے کھلے معجزات بھی لے کر آئے۔ ''بیّنات'' میں دونوں چیزیں یعنی واضح تعلیمات اور روشن معجزات شامل ہیں۔ لیکن جب ان قوموں نے ان رسولوں کا انکار کیا اور ان کی دعوت کو ردّ کر دیا تو وہ نسیاً منسیّا کر دی گئیں۔ جیسے کہ قرآن مجید میں ایک دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا گیا کہ: ﴿كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا﴾ (ھُود:٦٨و٩٥) ''وہ قومیں ایسے ہو گئیں جیسے کبھی دنیا میں تھیں ہی نہیں''۔ یہ وہ سزا ہے جو رسولوں کے انکار پر اس دنیا میں ملتی ہے۔ اس کے علاوہ ابھی ایک دوسری سزا باقی ہے اور وہ ہے آخرت کی سزا' یعنی جہنم! یہ مختصر سی تشریح و توضیح ہے اس آیت مبارکہ کی:

﴿اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَبَؤُا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ ۫ فَذَاقُوْا وَبَالَ اَمْرِهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ۝۵﴾

''کیا نہیں پہنچ چکی ہے تمہیں خبر ان کی جنہوں نے کفر کیا تھا پہلے؟ تو وہ اپنے کرتوتوں کی سزا کا ایک مزا (اس دنیا میں) چکھ چکے' اور ان کے لیے (آخرت میں دوسری سزا کے طور پر) دردناک عذاب تیار ہے''۔

اس جگہ ''استفہامِ تقریری'' کا اسلوب اس لیے اختیار کیا گیا کہ سورۃ التغابن مدنی سورت ہے۔ گویا قرآن مجید کا لگ بھگ دو تہائی حصہ جو مکی سورتوں پر مشتمل ہے' اس سے بہت پہلے نازل ہو چکا تھا جس میں ان اقوام کا ذکر بار ہا آ چکا تھا جو رسولوں کی دعوت کو ردّ کرنے کے جرم کی پاداش میں ہلاک کر دی گئی تھیں۔

رسالت کے ضمن میں اگلی آیت میں جو دوسری نہایت اہم بات بیان ہوئی وہ یہ ہے کہ رسولوں کے باب میں لوگوں نے جو سب سے بڑی ٹھوکر کھائی اور ان کو ماننے اور ان پر ایمان لانے میں جو سب سے بڑی رکاوٹ ان کے سامنے آ گئی وہ ان رسولوں کی بشریت تھی۔ ظاہر ہے کہ رسول انسان تھے' انسانوں کی طرح کھاتے پیتے تھے۔ وہ نبوت و رسالت پر فائز ہونے سے قبل دنیا میں کاروبار کرتے تھے' بازاروں میں چلتے پھرتے تھے' ان کو بھی وہ احتیاجیں لاحق ہوتی تھیں جو دوسرے تمام انسانوں کو لاحق ہوتی ہیں۔ جیسے خود نبی اکرم ﷺ نے مکہ میں چالیس برس کی عمر شریف تک کاروبار کیا ہے۔ چنانچہ

مشرکین مکہ نبی اکرم ﷺ پر اجرائے وحی اور ظہورِ نبوت کے بعد اسی نوع کے اعتراضات وارد کیا کرتے تھے جن کا قرآن مجید میں مختلف اسالیب سے متعدد مقامات پر ذکر ہوا ہے۔ مثلاً سورۃ الفرقان میں اللہ تعالیٰ نے مشرکین مکہ کا یہ قول نقل فرمایا ہے: ﴿وَقَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ ۭ﴾ (الفرقان:٧) ''اور (یہ مشرکین) کہنے لگے کہ اس رسول کی کیا کیفیت ہے کہ کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے؟'' لہٰذا ہمیشہ یہی ہوا کہ رسولوں کی بشریت ان پر ایمان لانے میں بہت بڑی رکاوٹ بنتی رہی کہ یہ تو ہم جیسے انسان ہیں' ہماری ہی طرح کے ہاتھ پاؤں ان کے بھی ہیں اور ہماری ہی طرح کی ضروریات و حوائج ان کو بھی لاحق ہیں' پھر یہ کیسے ہماری ہدایت پر مأمور ہو سکتے ہیں؟ چنانچہ یہ ہے وہ سب سے بڑی ٹھوکر جو لوگوں نے نبوت و رسالت کے باب میں کھائی اور یہ ہے وہ سب سے بڑا حجاب جو رسالت کے باب میں لوگوں کے سامنے آیا' جسے کفر کے سرداروں اور وقت کے بڑے بڑے چودھریوں نے جن کی سیادت و قیادت کو رسول کی دعوتِ توحید سے خطرہ لاحق ہوتا تھا' لوگوں کو ورغلانے کا ذریعہ بنایا۔ انہوں نے لوگوں سے کہا کہ تم اپنے ہی جیسے انسان کو رسول مان کر ان کا اتباع کرو گے تو بڑے گھاٹے میں رہو گے۔ چنانچہ انہوں نے خود بھی رسولوں کی تصدیق سے انکار کیا اور عامۃ الناس کو بھی اس سے باز رکھا — اسی حقیقت کا ذکر ہے اگلی آیت مبارکہ میں کہ رسولوں کی دعوت سے انکار کا ایک اہم سبب ان کا انسان ہونا بھی رہا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهٗ كَانَتْ تَّاْتِيْهِمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَقَالُوْٓا اَبَشَرٌ يَّهْدُوْنَنَا ۡ فَكَفَرُوْا وَتَوَلَّوْا وَّاسْتَغْنَى اللّٰهُ ۭ وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ Ċ﴾

''یہ اس لیے ہوا کہ ان کے پاس ان کے رسول واضح اور روشن تعلیمات اور معجزات کے ساتھ آتے رہے تو انہوں نے کہا کہ کیا بشر ہمیں ہدایت دیں گے؟ پس انہوں نے کفر کیا اور پیٹھ موڑ لی تو اللہ نے بھی استغناء اختیار فرمایا' اور اللہ تو ہے ہی غنی اور (اپنی ذات میں از خود) محمود (اور ستودہ صفات)''۔

یہاں آیت کے آخری الفاظ میں سمجھانے کا بڑا ہی پیارا انداز ہے۔ یعنی اللہ

بے نیاز ہے' اس کو کسی کی احتیاج نہیں۔ کوئی اسے مان لے تو اس کی بادشاہی میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا اور کوئی انکار کر دے تو اس کی جلالتِ شان میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔ یہ تو اس کا کرم' اس کا فضل اور اس کی عنایت و رحمت ہے کہ اس نے انسانوں کی ہدایت کے لیے ان ہی میں سے رسول مبعوث فرمائے' جنہیں اپنی ہدایتِ کاملہ سے سرفراز فرمایا اور جن پر اپنی کتاب نازل کی۔ اب اگر کوئی ناقدری کرے اور انکار و اعراض کی روش اختیار کرے تو اس سے اللہ کا کچھ نہیں بگڑتا' اس لیے کہ ان سے اللہ کی کوئی غرض وابستہ نہیں ہے۔ البتہ اس کا فوری نقصان اور خسارہ ان ناشکروں اور نافرمانوں کو یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی نظرِ عنایت اور نگاہِ التفات کا رُخ ان کی جانب سے پھیر لیتا ہے اور اپنی شانِ بے نیازی کا اظہار فرماتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ بے نیازی کا جامہ تو صرف اسی کی ذات پر راست آتا ہے' اس لیے کہ وہ ''الغنی'' بھی ہے اور ''الحمید'' بھی!

رسالت کے ضمن میں ایک گمراہی کے دو مختلف مظاہر

یہاں یہ بات بھی غور طلب ہے کہ رسالت کے باب میں ایک گمراہی کا ظہور تو اس طرح ہوتا ہے کہ لوگ رسول کی رسالت کو اس دلیل سے ردّ کر دیتے ہیں کہ یہ تو ہمارے ہی جیسا انسان ہے۔ گویا رسول کی بشریت قبولِ حق میں مانع ہو جاتی ہے' جس کا مفصل ذکر اس آیت میں آ گیا۔ لیکن یہ معاملہ یہیں پر ختم نہیں ہو جاتا' بلکہ اسی مرض کا ظہور رسولوں کی اُمتوں میں بعد میں ایک دوسری شکل میں ہوتا ہے اور وہ یہ کہ بہت سے لوگ محبت اور عقیدت کے غلو کے باعث نبیوں اور رسولوں کی بشریت کا انکار کر دیتے ہیں۔ گویا بنیادی طور پر مرض وہی ہے کہ بشریت اور نبوت و رسالت میں لوگوں نے بُعد اور تضاد محسوس کیا اور اس سبب سے ایک جانب منکروں اور کافروں نے رسول کی بشریت کی بنیاد پر اس کی رسالت کی نفی کر دی اور اس کی دعوت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا' اور دوسری جانب غالی اُمتیوں نے رسولوں کی رسالت کی بنیاد پر اُن کی بشریت کا انکار کر دیا' یہاں تک کہ بعض انبیاء و رُسل کو خدا کا بیٹا قرار دے کر الوہیت میں شریک کر دیا گیا۔ جیسے یہود کے ایک گروہ نے حضرت عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا قرار دیا' اور پال کے

متبعین نے تو حد ہی کر دی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا صُلبی بیٹا قرار دے کر مستقل تثلیث ایجاد کر لی۔ گویا ذہنی مرض اور گمراہی ایک ہی ہے‘ البتہ اس کے ظہور کی شکلیں مختلف ہیں۔یعنی رسولوں کی موجودگی میں بشریت کی بنیاد پر رسالت کا انکار اور بعد میں رسالت کی بنیاد پر بشریت کا انکار!

وقوعِ قیامت کا پُر زور اثبات

اس کے بعد ایمان بالآ خرۃ یا ایمان بالمعاد کا بیان شروع ہوتا ہے‘ اور ساتویں آیت اسی مضمون پر مشتمل ہے۔ ایمان بالآ خرۃ کی عقلی اور منطقی اساس تو ایمان باللہ کے ضمن میں تیسری آیت کے آخر ہی میں ’’وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ‘‘ کے الفاظِ مبارکہ میں قائم کر دی گئی تھی۔ اب یہاں بڑی فصاحت و بلاغت اور بڑے شدّ و مد کے ساتھ ایک آیت میں اس کے انکار کی پُر زور نفی اور اس کے وقوع کا نہایت تاکیدی اثبات کر دیا گیا۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: ﴿زَعَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنْ لَّنْ يُّبْعَثُوْا ط﴾ ’’مغالطہ ہو گیا ہے اِن کافروں کو کہ ان کو دوبارہ اٹھایا نہ جائے گا‘‘۔ زعم کا لفظ اردو میں بھی بے بنیاد خیال کے معنوں میں مستعمل ہے۔ جیسے ہم کہتے ہیں کہ فلاں کو بڑا زعم ہے‘ یعنی اسے اپنے بارے میں مغالطہ ہے اور وہ اپنے آپ کو بہت کچھ سمجھتا ہے‘ درآنحالیکہ اس کی اصل حیثیت کچھ نہیں ہے اور وہ محض ایک خیالِ خام اور ایک بے بنیاد ظن میں مبتلا ہے۔ کفار اسی زعم اور خیالِ خام میں مبتلا تھے کہ مرنے کے بعد اُن کو دوبارہ اٹھایا نہ جائے گا۔ قرآن مجید میں کفار کے اس اعتراض اور استعجاب کو بہت سے مقامات پر مختلف الفاظ میں بیان کیا گیا ہے‘ اور خاص طور پر مکی سورتوں میں ان کے اس خیالِ خام کی نفی اور بعث بعد الموت کے اثبات کے لیے آفاق و انفس سے مفصل دلائل دیے گئے ہیں۔ یہاں ان دلائل و براہین کے اعادے کے بجائے نبی اکرم ﷺ کو حکم دیا جا رہا ہے کہ: ﴿قُلْ بَلٰى وَرَبِّىْ لَتُبْعَثُنَّ ثُمَّ لَتُنَبَّؤُنَّ بِمَا عَمِلْتُمْ ط﴾ ’’(اے نبیؐ!) کہہ دیجیے کیوں نہیں‘ اور مجھے اپنے ربّ کی قسم ہے‘ تم لازماً اٹھائے جاؤ گے‘ پھر تم نے (دنیا میں) جو کچھ کیا ہے وہ لازماً تمہیں جتلا دیا جائے گا (تمہارے سامنے رکھ دیا جائے گا)‘‘۔ اس اسلوب میں جو زور اور تاکید ہے اس کا صحیح

اندازہ وہی لگا سکتے ہیں جو عربی زبان سے تھوڑی بہت واقفیت رکھتے ہوں۔ عربی زبان میں اس سے زیادہ تاکید کا کوئی اور اسلوب نہیں ہے کہ فعل مضارع سے پہلے لامِ مفتوح اور آخر میں نونِ مشدّد ہو۔ یہاں تاکید کا یہی اسلوب آیا ہے۔

اس آیت کے آخر میں ارشاد فرمایا: ﴿وَذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ﴾ ''اور یہ چیز اللہ پر بہت آسان ہے''۔ یعنی بظاہر تمہیں بہت مشکل معلوم ہو رہا ہے' لیکن جب اللہ کو مان لیا جائے اور یہ بھی تسلیم کر لیا جائے کہ وہ ہر چیز پر قادر ہے تو اس استعجاب کی گنجائش کہاں باقی رہتی ہے؟ جس قادرِ مطلق نے پہلے پیدا کیا تھا اس کے لیے دوبارہ پیدا کرنا بہت آسان ہے۔

جیسے کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے' اس آیت مبارکہ میں کوئی عقلی استدلال یا منطقی دلیل موجود نہیں ہے' بلکہ یہاں دراصل خطابی اور اذعانی دلیل کا اسلوب ہے۔ یعنی نبی اکرم ﷺ سے فرمایا جا رہا ہے کہ آپؐ پورے یقین و وثوق کے ساتھ اللہ کی قسم کھا کر اور اپنے ربّ کی شہادت پیش کرتے ہوئے ان منکرین سے کہہ دیجیے کہ ایسا لازماً ہو کر رہے گا اور تم لازماً محاسبہ کے لیے دوبارہ اٹھائے جاؤ گے۔ زیادہ گہرائی میں غور کیا جائے تو نظر آتا ہے کہ یہاں دراصل نبی اکرم ﷺ کی سیرت و شخصیت کا وزن بطورِ دلیل پیش کیا جا رہا ہے کہ غور کرو کہ یہ کون کہہ رہا ہے اور کس کی زبانِ مبارک سے یہ کلمات ادا کرائے جا رہے ہیں! اس کی سیرت اور اخلاق کا عالم کیا ہے! اس کی صداقت و امانت کے بارے میں تمہاری متفقہ رائے کیا ہے! وہ ''الصادق'' اور ''الامین'' شخص ہے جو قسم کھا کر بعث بعد الموت کی خبر دے رہا ہے اور پورے یقین اور اذعان کے ساتھ دے رہا ہے۔ یعنی وہ فلسفیوں کی طرح یہ نہیں کہہ رہا کہ میرا گمان یہ ہے' یا میرا خیال یہ ہے' یا میری عقل یہ حکم لگاتی ہے' یا مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے' بلکہ پورے وثوق کے ساتھ خبر دے رہا ہے کہ ایسا ہو کر رہے گا۔ گویا یہ فلسفیانہ کلام نہیں ہے کہ جس میں کسی شک و شبہ کا امکان ہو' بلکہ اللہ کا کلام ہے جو رسول اللہ ﷺ کی زبان سے ادا ہو رہا ہے۔ لہٰذا اس میں شبہ کا ذرا بھی شائبہ موجود نہیں!

مزید برآں رسولوں کا معاملہ محض ''ایمان بالغیب'' کا نہیں ہوتا' بلکہ انہیں حیاتِ دُنیوی ہی میں ''ملکوت السّمٰوٰت والارض'' یہاں تک کہ جنت اور دوزخ کا مشاہدہ کرا دیا جاتا ہے تاکہ وہ لوگوں کو احوالِ آخرت کی جو خبریں دیں تو اپنے ذاتی مشاہدہ اور معائنہ کی اساس پر اور کامل یقین واذعان کے ساتھ دیں۔ پس معلوم ہوا کہ یہاں اگرچہ کوئی عقلی و منطقی دلیل موجود نہیں ہے' لیکن اس اسلوبِ بیان اور اندازِ کلام میں ایک بڑی عظیم اذعانی و ایقانی دلیل مضمر ہے جس میں اصل وزن جناب محمدٌ رسول اللہ ﷺ کی سورج کے مانند روشن سیرت وشخصیت کا ہے۔ چنانچہ سیرت کی کتابوں میں ذکر موجود ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے جب کوہِ صفا پر کھڑے ہو کر اپنا پہلا دعوتی وتبلیغی خطبہ ارشاد فرمایا تو پہلے لوگوں سے دریافت کیا کہ تم نے مجھے کیسا پایا؟ گویا پہلے ان سے اپنی اس صداقت' امانت اور دیانت کی تصدیق وتوثیق کرالی جسے وہ بہت پہلے سے تسلیم کر چکے تھے' بعد میں دعوت پیش فرمائی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ مخاطبین یہ سوچیں کہ جس شخص نے کبھی جھوٹ نہ بولا ہو' جس کا شعار ہی صداقت وامانت ہو' جس نے کبھی کسی کو دھوکہ اور فریب نہ دیا ہو' کیا وہ اللہ پر جھوٹ باندھنے لگ جائے گا! کیا وہ پوری نوعِ انسانی کو فریب دینے پر آمادہ ہو جائے گا! پس حضور نبی اکرم ﷺ کی یہی سیرت وکردار اور آپ ﷺ کا یہی اخلاقِ حسنہ سورۃ التغابن کی ساتویں آیت کے پس منظر میں بطورِ دلیل پنہاں ہے۔

نبی اکرم ﷺ کی دعوت کے ابتدائی دَور کا ایک خطبہ بھی ملتا ہے جسے ''نہج البلاغہ'' میں نقل کیا گیا ہے اور جس میں بالکل وہی انداز' وہی اسلوب' فصاحت و بلاغت کا وہی معیار اور خطابت کی وہی شان ہے جو اِس آیتِ مبارکہ کا طرۂ امتیاز ہے۔ نبی اکرم ﷺ خود بھی اس کے مدعی ہیں کہ: ((اَنَا اَفْصَحُ الْعَرَبِ))[1] ''میں عرب کا فصیح ترین انسان ہوں''۔

اور واقعہ یہ ہے کہ آپ ﷺ کا یہ خطبہ اس دعویٰ کی بہت بڑی دلیل ہے۔ ارشاد فرمایا:

((اِنَّ الرَّآئِدَ لَا یَکْذِبُ اَھْلَهٗ ' وَاللّٰهِ لَوْ کَذَبْتُ النَّاسَ جَمِیْعًا مَا کَذَبْتُکُمْ' وَلَوْ غَرَرْتُ النَّاسَ جَمِیْعًا مَا غَرَرْتُکُمْ' وَاللّٰهِ الَّذِیْ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اِنِّیْ

(۱) تلخیص الحبیر لابن حجر العسقلانی ۴/۱۲۹۸۔

لَرَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ خَاصَّۃً وَاِلَی النَّاسِ کَافَّۃً، وَاللّٰہِ لَتَمُوْتُنَّ کَمَا تَنَامُوْنَ، ثُمَّ لَتُبْعَثُنَّ کَمَا تَسْتَیْقِظُوْنَ، ثُمَّ لَتُحَاسَبُنَّ بِمَا تَعْمَلُوْنَ، ثُمَّ لَتُجْزَوُنَّ بِالْاِحْسَانِ اِحْسَانًا وَبِالسُّوْءِ سُوْءً، وَاِنَّھَا لَجَنَّۃٌ اَبَدًا اَوْ لَنَارٌ اَبَدًا)) [1]

''لوگو! تم جانتے ہو کہ رائد (قافلہ کا رہبر ورہنما) اپنے قافلے کو کبھی دھوکہ نہیں دیتا۔ اللہ کی قسم! اگر (بفرضِ محال) میں تمام انسانوں سے جھوٹ کہہ سکتا تب بھی تم سے کبھی نہ کہتا' اور اگر تمام انسانوں کو فریب دے سکتا تب بھی تمہیں کبھی نہ دیتا۔ اس اللہ کی قسم جس کے سوا کوئی الٰہ نہیں! میں اللہ کا رسول ہوں تمہاری طرف خصوصاً اور پوری نوعِ انسانی کی طرف عموماً ـــــ اللہ کی قسم! تم سب یقیناً مر جاؤ گے جیسے (روزانہ) سو جاتے ہو' پھر یقیناً اٹھائے جاؤ گے جیسے (ہر صبح) بیدار ہو جاتے ہو۔ پھر لازماً تمہارے اعمال کا حساب کتاب ہوگا اور پھر لازماً تمہیں پورا پورا بدلہ ملے گا' اچھائی کا اچھا اور برائی کا برا' اور وہ جنت ہے ہمیشہ کے لیے یا آگ ہے دائمی''۔

اب تک کے مطالعے پر ایک نگاہِ بازگشت ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سات آیات میں ایمانیاتِ ثلاثہ یعنی توحید' رسالت اور آخرت کا بیان ہو گیا۔ چنانچہ توحید اور صفاتِ باری تعالیٰ کے ضمن میں چار آیات' رسالت کے موضوع پر دو آیات' اور آخرت یا معاد کے بارے میں ایک آیت وارد ہوئی۔ ان ایمانیاتِ ثلاثہ بالخصوص ایمان بالآخرت کی مزید تشریح ایک خطبۂ نبویؐ سے بھی ہمارے سامنے آ گئی۔ اب اگلی یعنی آٹھویں آیت سے ایمان کی پُر زور دعوت دی جا رہی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: ﴿فَاٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَالنُّوْرِ الَّذِیْٓ اَنْزَلْنَاط﴾ ''پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول (ﷺ) پر اور اس نور پر جو ہم نے نازل کیا (یعنی قرآن مجید)'' ـــــ ان الفاظ میں اوّلاً اللہ پر ایمان کی دعوت دی گئی اور پھر ایمان بالرسولؐ کے ساتھ اس نورِ ہدایت پر ایمان کو بھی شامل کر لیا گیا جو وحی اور کتاب کی صورت میں رسولؐ پر نازل کیا گیا۔ اور چونکہ بعد کی دو آیات (۹ اور ۱۰) میں ایمان بالآخرت کی زوردار دعوت آ رہی ہے لہٰذا آیت ۸ کے اختتام پر ایک بار

---

(۱) بحواله جمهرة الخطب، ص ۵۔ وفقه السيرة للالبانی، ص ۹۷۔

پھر اللہ کی صفتِ علم کا حوالہ دے دیا گیا کہ :﴿وَاللّٰہُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ﴾ ''اور جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اس سے باخبر ہے!'' یعنی وہ تمہاری ہر ہر حرکت' ہر ہر عمل اور ہر ہر فعل ہی نہیں' تمہاری نیتوں اور ارادوں سے بھی باخبر ہے' یہاں تک کہ تمہارے تحت الشعور اور لاشعور بھی اس پر بالکل عیاں ہیں!

ہار اور جیت کے فیصلے کا دن

اگلی دو آیات (۹'۱۰) میں پھر ایمان بالآخرت کا بیان ہے۔ اس سے قبل آیت ۷ میں بھی ایمان بالآخرت کے اوّلین اور اہم ترین جزو یعنی بعث بعد الموت کا اثبات نہایت پُر زور انداز میں ہو گیا ہے۔ اب ان دو آیات میں اوّلاً آخرت کی اصل حقیقت اجمالاً بیان کی گئی' یعنی قیامت کا دن ہی ہار اور جیت' اور کامیابی و ناکامی کے اصل فیصلے کا دن ہے۔ جو اُس دن کامیاب قرار پائے گا وہی حقیقتاً کامیاب ہو گا اور جو اُس روز ناکام قرار دے دیا گیا وہی اصلاً ناکام ہو گیا۔ گویا جو اُس دن جیتا وہی جیتا اور جو اُس دن ہارا وہی ہارا! ـــــــ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: ﴿یَوْمَ یَجْمَعُکُمْ لِیَوْمِ الْجَمْعِ ذٰلِکَ یَوْمُ التَّغَابُنِ ط﴾ ''وہ دن کہ جس دن وہ (اللہ) تمہیں جمع کرے گا جمع ہونے کے دن (یعنی یوم قیامت)' وہی ہے ہار اور جیت کے فیصلے کا اصل دن' ـــــ ''تغابن'' بنا ہے لفظ ''غبن'' سے۔ غبن کا لفظ ہمارے یہاں اردو میں بھی مستعمل ہے' یعنی کسی کو نقصان پہنچانا' کسی کا مال دبا لینا' مالک کی اجازت اور اس کے علم میں لائے بغیر اس کے مال میں تصرف کر لینا' یہ تمام مفاہیم لفظ غبن میں شامل ہیں۔ لیکن جب یہ لفظ باب تفاعل میں ''تغابن'' کی صورت اختیار کرتا ہے تو اس میں مزید بہت سے معانی و مطالب شامل ہو جاتے ہیں۔ ''تغابن'' کا لفظ اس کیفیت کو ظاہر کرتا ہے جو اِس دنیا کے جملہ معاملات میں معلوم و معروف ہے۔ یعنی یہ کہ اس دنیا میں جو باہمی معاملات ہوتے ہیں ان میں ہر فریق چاہتا ہے کہ وہ دوسرے سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائے یا بالفاظِ دیگر دوسرے کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچائے۔ دکان دار چاہے گا کہ گاہک سے زیادہ سے زیادہ منافع حاصل کرے' جبکہ خریدار کی خواہش ہو گی کہ اسے داموں میں زیادہ سے زیادہ رعایت حاصل

ہو۔اسی طرح کاروبارِ دنیا کے ہر شعبے میں ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی ایک دوڑ لگی ہوئی ہے۔پس ایک دوسرے کو زیادہ سے زیادہ زک پہنچانے کی کوشش کا نام ہے ''تغابن''۔

اس تغابن کا ایک ظہور تو دُنیوی معاملات میں ہر آن ہو رہا ہے کہ کسی کی جیت ہو رہی ہے اور کسی کی ہار' اور کسی کو نفع حاصل ہو رہا ہے اور کسی کو نقصان۔لیکن اس دنیا کی ہار جیت بھی عارضی ہے اور نفع نقصان بھی عارضی ہے۔ ہار جیت کے فیصلے کا اصل دن یومِ قیامت ہے' اس لیے کہ اس دن کی جیت بھی ابدی ہوگی اور ہار بھی دائمی ہوگی' اور نفع بھی مستقل ہوگا اور نقصان بھی دائمی ہوگا۔ اس کے لیے یہاں فرمایا گیا: ﴿ذٰلِكَ يَوْمُ التَّغَابُنِ﴾ کہ اصل میں تو وہاں جا کر کھلے گا کہ کون کیا تھا اور کس کی حقیقت کیا تھی! اور کون بامراد ہوا اور کون نامراد! اور ہار کس کی ہوئی اور جیت کس کی! رہی اس دنیا کی ہار جیت اور کامیابی و ناکامی' تو یہ سب عارضی اور فانی ہیں۔اصل تختہ' واصل باقی' یعنی اصل بیلنس شیٹ تو قیامت کے روز سامنے آئے گی!

آگے اسی ہار جیت اور کامیابی و ناکامی کی تفصیل بیان ہوئی ہے:

﴿وَمَنْ يُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ وَيَعْمَلْ صَالِحًا يُّكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّاٰتِهٖ وَيُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝﴾

''اور جو اللہ پر ایمان رکھے گا اور عمل کرے گا بھلے اور درست اللہ اس سے اس کی برائیوں کو دور فرما دے گا اور داخل کرے گا اسے ان باغات میں جن کے دامن میں ندیاں بہتی ہوں گی' جن میں وہ ہمیشہ ہمیش رہیں گے۔ یہی ہے بڑی اور اصل کامیابی''۔

یہ جیت کی شرح ہوگئی' یعنی جنت میں داخلہ اور ہمیشہ کا خلود! گویا یہ ہے مستقل' واقعی اور حقیقی جیت! اس کے برعکس ہار کیا ہے؟ اسے آیت ۱۰ میں واضح فرما دیا گیا:

﴿وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝﴾

''اور جن لوگوں نے انکار کیا اور ہماری آیات کو جھٹلایا وہ آگ والے ہیں' جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے' اور وہ بہت ہی برا ٹھکانہ ہے''۔

اس موقع پر ایک اور ضروری بات بھی سمجھ لینی چاہیے۔ وہ یہ کہ قرآن مجید میں جہاں کفر اور تکذیب دونوں جرائم کا ذکر ساتھ ساتھ ہوتا ہے وہاں کفر اس کیفیت کو ظاہر کرتا ہے کہ اللہ کی معرفت کی جو شہادتیں انسان کی اپنی فطرت اور اس کے اپنے باطن میں مضمر ہیں' انسان ان کو دبا دے' چھپا دے اور انہیں بروئے کار نہ آنے دے۔ اور تکذیب اس کے اوپر دہرا جرم ہے کہ جب رسول آئے' کتاب اتری' اور نورِ وحی نے حق کو بالکل روشن اور مبرہن کر دیا تو اس نے اسے جھٹلا دیا۔ اس طرح دو جرم جمع ہو گئے۔ گویا کفر اور تکذیب بالکل ہم معنیٰ نہیں ہیں' بلکہ سورۃ النور کی آیت ۴۰ میں وارد الفاظ ﴿ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ ؕ﴾ کے مصداق ظلم پر مزید ظلم اور ایک جرم پر دوسرے جرم کے اضافے کے مترادف ہیں۔

خلاصۂ مباحث

سورۃ التغابن کے پہلے رکوع کی مختصر تشریح و توضیح ختم ہوئی۔ اس رکوع میں سب سے پہلے اللہ کی ہستی' اس کی توحید اور اس کی صفاتِ کمال پر آیاتِ آفاقی کی شہادت کو اس پیرائے میں بیان کیا گیا ہے کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اللہ کی تسبیح کر رہا ہے۔ اور پھر اس کی جلالتِ شان اور اس کی بعض صفاتِ کمال خصوصاً ''قدرت'' اور ''علم'' کا بیان ہوا۔ پھر رسالت کے ذیل میں رسولوں کی تکذیب کرنے والی قوموں کے عذابِ الٰہی سے ہلاک ہونے کا بیان بھی آ گیا اور رسالت کے باب میں ان کی اصل گمراہی کی نشاندہی بھی کر دی گئی کہ انہوں نے بشریت اور نبوت و رسالت کو ایک دوسرے کی ضد خیال کیا۔ اس کے بعد منکرینِ بعث بعد الموت کی شدت کے ساتھ تردید اور بعث بعد الموت' حشر و نشر اور جزا و سزا کا بیان اور اس حقیقت کی وضاحت ہوئی کہ اصل ہار جیت اور کامیابی و ناکامی کا فیصلہ قیامت کے دن ہوگا۔ ساتھ ہی اللہ تعالیٰ' اُس کے رسول ﷺ اور قرآن مجید پر ایمان کی پُرزور دعوت بھی آ گئی۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو حقیقی ایمان نصیب فرمائے' ہمارے قلوب و اذہان کو ایمان کے حقیقی نور سے منور فرمائے اور ہمیں آخرت کی فوز و فلاح سے بہرہ ور فرمائے۔ آمین یا ربّ العالمین!

گزشتہ صفحات میں سورۃ التغابن کے پہلے رکوع کا مطالعہ مکمل ہو چکا ہے۔ چنانچہ اس رکوع کی کُل دس آیتوں میں سے پہلی سات آیات میں ایمانیاتِ ثلاثہ یعنی توحید' معاد اور رسالت کا بیان بھی ہو چکا ہے ـــــ اور بقیہ تین آیات میں ایمان کی نہایت مؤثر اور زوردار دعوت بھی آ چکی ہے۔ اس رکوع کے مضامین کی تقسیم و ترتیب کے ضمن میں ایک نہایت حسین توازن ہمارے سامنے آتا ہے' اور وہ یہ کہ جہاں ایمان کے بیان میں چار آیات توحید کے لیے وقف ہیں اور رسالت اور معاد دونوں کو تین آیات میں سمو لیا گیا ہے' وہاں دعوتِ ایمان کے ضمن میں توحید و رسالت پر ایمان کی دعوت صرف ایک آیت میں آ گئی ہے' جبکہ ایمان بالآخرت کے لیے نہ صرف یہ کہ دو نہایت عظیم اور پُر جلال آیات کلیتاً وقف ہیں بلکہ اس کا ذکر ضمنی طور پر توحید و رسالت پر ایمان کی دعوت والی آیت کے اختتام پر بھی موجود ہے ـــــ اور اس کا سبب وہی ہے جس کی جانب اس سے قبل بھی اشارہ کیا جا چکا ہے' یعنی یہ کہ اگرچہ علمی اور نظری اعتبار سے اصل ایمان' ایمان باللہ ہے' لیکن عملی اعتبار سے سب سے زیادہ مؤثر ایمان' ایمان بالآخرت ہے۔ اس عکسی ترتیب کا ایک اضافی فائدہ یہ ہوا کہ چونکہ دوسرے رکوع میں ایمان کے عملی تقاضوں کا بیان آ رہا ہے' لہٰذا پہلے رکوع کے اختتام پر ایمان بالآخرت کی نہایت مؤثر تاکید اس کے لیے حد درجہ مناسب تمہید بن گئی!

ایمان کے پانچ بنیادی لوازم

اب ہم اللہ کے نام سے دوسرے رکوع کا مطالعہ شروع کرتے ہیں۔ یہ رکوع آٹھ آیات پر مشتمل ہے' جن میں سے پہلی پانچ آیات میں ایمان کے پانچ بنیادی نتائج کا ذکر ہے اور بقیہ تین آیات میں ان عملی تقاضوں کو بالفعل ادا کرنے کی تاکیدی دعوت ہے۔ لہٰذا پہلے ہم ابتدائی پانچ آیات کا مطالعہ کرتے ہیں' جن کا متن اور سلیس و رواں ترجمہ حسبِ ذیل ہے:

﴿مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَمَنْ يُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهٗ ؕ وَاللّٰهُ

بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ⑪ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاِنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ⑫ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ⑬ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَاَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ ۚ وَاِنْ تَعْفُوْا وَتَصْفَحُوْا وَتَغْفِرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ⑭ اِنَّمَا اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ؕ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ⑮﴾

''نہیں نازل ہوتی کوئی مصیبت مگر اللہ کی اجازت سے۔اور جو کوئی اللہ پر ایمان رکھتا ہے اللہ اس کے دل کو ہدایت دیتا ہے۔اور اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔اور اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو (اس کے) رسول (ﷺ) کی۔پھر اگر تم نے روگردانی کی تو (جان رکھو کہ) یقیناً ہمارے رسول پر تو صرف صاف صاف پہنچا دینے کی ذمہ داری ہے۔اللہ وہ ہستی ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے' پس اہل ایمان کو صرف اللہ پر بھروسہ کرنا چاہیے۔اے اہل ایمان! یقیناً تمہاری بیویوں اور تمہاری اولاد میں سے بعض تمہارے دشمن ہیں' پس ان سے بچ کر رہو' اور اگر تم معاف کر دیا کرو اور چشم پوشی سے کام لو اور بخش دیا کرو تو بے شک اللہ بھی بخشنے والا رحم فرمانے والا ہے۔بلاشبہ تمہارے مال اور تمہاری اولاد (تمہارے حق میں) فتنہ ہیں' اور اللہ ہی ہے جس کے پاس بڑا اجر ہے''۔

جیسا کہ اس سے قبل عرض کیا جا چکا ہے' اس سورۂ مبارکہ کے دوسرے رکوع میں جو آیات ہیں ان میں نہایت جامعیت کے ساتھ ایمان کے مقتضیات و متضمنات' مضمرات و مقدرات اور ثمرات و نتائج کا ذکر ہے۔گویا ان مضمرات کو کھولا گیا ہے جو ''ایمان'' میں بالکل اسی طرح مخفی ہیں جیسے آم کی گٹھلی میں آم کا پورا درخت بِالقُوّہ (in potential) موجود ہوتا ہے' اس لیے کہ ''ایمان'' ایک خاص مابعد الطبیعیاتی فکر کا عنوان ہے جس سے انسان کا ایک خاص زاویۂ نظر بننا چاہیے اور انسان کے اندازِ فکر میں ایک مخصوص تبدیلی پیدا ہونی چاہیے' اور زاویۂ نگاہ اور طرزِ فکر کی اس تبدیلی کے نتیجے میں اس کی پوری زندگی میں ایک انقلاب آ جانا چاہیے۔اگر یہ انقلاب بالفعل رونما نہیں ہوتا

تو اس کا صاف مطلب یہ ہوگا کہ ابھی ایمان کا اقرار صرف نوکِ زبان تک محدود ہے اور اس نے انسان کی فکر میں جڑیں نہیں پکڑیں۔ اس بات کو اس مثال سے نہایت آسانی کے ساتھ سمجھا جا سکتا ہے کہ ایک تو ایسا ٹُنڈ منڈ درخت ہوتا ہے جس میں نہ پتے ہوتے ہیں‘ نہ پھول نہ پھل۔ اور ایک ایسا سرسبز وشاداب اور بارآور اور مثمر درخت ہوتا ہے جس میں خوبصورت پتے بھی ہیں اور حسین ودلفریب پھول یا میٹھے اور فرحت بخش پھل بھی۔ تو معاذ اللہ‘ ایمانِ حقیقی کسی ٹُنڈ منڈ درخت کے مانند نہیں ہوتا‘ بلکہ ایک سرسبز وشاداب اور مثمر و بارآور درخت کے مشابہ ہوتا ہے۔ چنانچہ جب ایمان اِقْرَارٌ بِاللِّسَانِ سے آگے بڑھ کر تَصْدِیْقٌ بِالْقَلْبِ کی صورت اختیار کرتا ہے اور دل میں راسخ ہو جاتا ہے‘ گویا جب انسان کا باطن نورِ ایمان سے منور ہو جاتا ہے تو اس کے اثرات اور اس کے ثمرات ونتائج انسانی شخصیت میں لازماً ظاہر ہوتے ہیں۔

اس بات کو یوں کہہ لیجیے کہ اگر کوئی شخص سلیم الفطرت ہے‘ گویا اس کے قلب کی زمین صالح ہے‘ تو جب اس میں ایمان کا بیج جمتا اور پھوٹتا اور نشوونما پاتا ہے تو وہ رفتہ رفتہ ایک تناور درخت کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اس درخت میں خوبصورت پتے بھی لگتے ہیں اور حسین وجمیل پھول بھی‘ جو وقت آنے پر خوش ذائقہ اور رسیلے پھلوں کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ ایمان کے اس شجرۂ طیبہ پر جن ثمراتِ طیبات کا ظہور ہوتا ہے ان میں سے پانچ کا ذکر ان پانچ آیات میں ہے۔ یعنی: (۱) تسلیم ورضا (۲) اطاعت وانقیاد (۳) توکل واعتماد (۴) ان خطرات سے متنبہ اور چوکس و چوکنا رہنا جو علائقِ دُنیوی خصوصاً بیویوں اور اولاد کی فطری محبت کے پردے میں انسان کے دین و ایمان اور آخرت و عاقبت کے لیے بالقوہ مضمر ہوتے ہیں‘ اور (۵) مال واولاد کے بارے میں آگاہ رہنا کہ یہ امتحان اور آزمائش کے ذرائع ہیں!

الغرض اگر کسی انسان کے دل میں ایمانِ حقیقی راسخ ہو جائے اور اس سے اس کا باطن منور ہو جائے تو اس کے نتیجے میں اس کی پوری شخصیت میں ایک تغیر اور انقلاب واقع ہو جاتا ہے‘ جیسا کہ علامہ اقبال نے فرمایا: ؎

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود
جاں چوں دیگر شد جہاں دیگر شود

حضرت علامہ نے تو یہ بات قرآن مجید کے بارے میں کہی ہے' لیکن چونکہ قرآن منبعِ ایمان ہے' لہٰذا یہی بات ایمان کے بارے میں کہی جا سکتی ہے کہ جب ایمان انسان کے باطن میں سرایت کر جاتا ہے تو اس کے باطن میں ایک انقلاب آ جاتا ہے' اس کی سوچ بدل جاتی ہے' اس کا نقطۂ نظر تبدیل ہو جاتا ہے' اس کا زاویۂ نگاہ بدل جاتا ہے' اس کی اَقدار تبدیل ہو جاتی ہیں۔ الغرض اس کی پوری سیرت و شخصیت' اس کا ہر فعل و عمل' اس کی پسند و ناپسند کا معیار اور اس کی سعی و جُہد کا رُخ سب بدل کر رہ جاتے ہیں' اور فی الواقع ایک بالکل نیا انسان وجود میں آ جاتا ہے۔ علامہ اقبال کے محولہ بالا شعر کا دوسرا مصرع بہت معنی خیز بلکہ ذو معنی ہے' اس لیے کہ اس میں جہاں ایک جانب اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ جب انسان میں یہ باطنی تبدیلی آ جاتی ہے تو اس کے لیے تو کُل جہاں ہی تبدیل ہو جاتا ہے' وہاں اس عظیم حقیقت کی جانب بھی راہنمائی موجود ہے کہ افرادِ نوعِ انسانی کا یہ باطنی انقلاب ہی ایک عالمی انقلاب کا پیش خیمہ بنتا ہے!

سورۃ التغابن کی جو پانچ آیات اس وقت زیرِ مطالعہ ہیں' اِن میں اللہ تعالیٰ نے نہایت معجز نما اسلوب میں ان پانچ بنیادی تبدیلیوں کی نشاندہی کر دی ہے جو ایمان کے نتیجے میں انسان کے نقطۂ نظر' اس کے اندازِ فکر اور اس کے عملی رویے اور روش میں نمایاں اور ظاہر ہو جانی چاہئیں۔ اس طرح ان آیات کے ذریعے ہمیں ایک کسوٹی مہیا ہو جاتی ہے جس پر اپنے ایمان کو پرکھ سکیں۔ چنانچہ اگر یہ اثرات و ثمرات ہماری شخصیتوں میں ظاہر ہو گئے ہوں تو ہمیں اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ ایمانِ حقیقی کا نور ہمارے دلوں میں موجود ہے' اور اگر یہ ظاہر نہیں ہو رہے ہیں تو گویا یہ ایک تنبیہہ ہے کہ ہمیں سوچنا چاہیے کہ ہم کہیں ایمانِ حقیقی کی روشنی سے محروم تو نہیں ہیں!

ایمان کے پانچ اساسی ثمرات کا بیان ان آیاتِ مبارکہ میں جس حکیمانہ ترتیب

کے ساتھ ہوا ہے اس کے صحیح فہم وشعور کے لیے پہلے اس حقیقت کو ذہن نشین کرلیں کہ اوّلاً ہر انسان اپنی انفرادی حیثیت میں انسانی معاشرے کی مکمل اکائی کا درجہ رکھتا ہے' اور ثانیاً اس کا اپنے معاشرے اور ماحول کے ساتھ گہرا ربط وتعلق ہوتا ہے۔ پھر ایک فرد کی حیثیت سے بھی انسان کی شخصیت کے دو رُخ ہیں۔ یعنی ایک تو وہ خارجی حالات و واقعات اور تغیرات وحوادث ہیں جو اس پر اثر انداز ہوتے ہیں اور دوسرے وہ افعال واعمال ہیں جو اس کے اعضاء و جوارح اور فی الجملہ پورے وجود سے ''صادر'' ہوتے ہیں۔ اسی طرح ہر فرد اپنے گرد وپیش اور معاشرے و ماحول سے دو قسم کے بندھنوں میں بندھا ہوا ہے' ایک علائقِ دُنیوی اور دوسرے مال واسبابِ دُنیوی' جنہیں علامہ اقبال مرحوم نے نہایت خوبصورتی سے اس شعر میں سمو دیا ہے کہ: ؎

یہ مال و دولتِ دنیا' یہ رشتہ و پیوند
بتانِ وہم و گماں' لا الٰہ الاّ اللہ!

پھر دو آیات میں انسان سے صادر ہونے والے اعمال و افعال کے ضمن میں دو پہلوؤں سے ایمان کے اثرات کا بیان ہے ——— اور آخری دو آیات میں ''مال ودولتِ دنیا'' اور ''رشتہ و پیوندِ دُنیوی'' کے ضمن میں ایک مؤمن کے نقطۂ نظر کو واضح کیا گیا ہے۔

۱) تسلیم ورضا

سب سے پہلی بات مصائبِ دُنیوی کے بارے میں فرمائی گئی۔ فرمایا: ﴿مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِیْبَۃٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰہِ ط﴾ ''نہیں نازل ہوتی کوئی مصیبت مگر اللہ کی اجازت سے''۔ آیت کے اس چھوٹے سے ٹکڑے میں معانی ومفاہیم کا ایک خزینہ پنہاں ہے۔ اس کی قدرے تشریح وتوضیح کی جائے تو وہ یہ ہوگی کہ اگر تم ایک علیم اور حکیم اللہ کو مانتے ہو کہ وہ ہر چیز پر قدرت بھی رکھتا ہے' اور یہ بھی تسلیم کرتے ہو کہ وہی اس کائنات کا اصل حکمران ہے اور اس کے اِذن کے بغیر ایک پتہ تک نہیں ہل سکتا' تو اس کا لازمی اور منطقی نتیجہ یہ ہے کہ کوئی مصیبت' کوئی تکلیف' کوئی نقصان' کوئی حادثہ' کوئی موت' کوئی افتاد اور کسی بھی

قسم کے ناخوشگوار واقعات وحوادث اِذنِ خداوندی کے بغیر وارد اور ظہور پذیر نہیں ہو سکتے ـــــ اب جو چیز اُس اللہ کے اِذن سے ہو جو سمیع بھی ہے اور بصیر بھی، علیم بھی ہے اور خبیر بھی اور ان سب پر مستزاد کامل حکیم بھی، تو اس پر شکوہ و شکایت کیسی اور اس پر دل میں تکدّر کیوں؟

واضح رہے کہ یہاں اس صدمہ اور ملال کی بات نہیں ہو رہی جس کا فوری اور غیر اختیاری اثر طبیعت پر ہوتا ہے، بلکہ یہاں اس حقیقت کی جانب رہنمائی ہو رہی ہے کہ بندۂ مؤمن کا قلب ناخوشگوار واقعات و حوادث سے کوئی مستقل تأثر قبول نہیں کرتا۔ چنانچہ نہ اس کی زبان پر گلہ اور شکوہ آتا ہے اور نہ ہی اس کے دل میں اپنے ربّ کی جانب سے کسی بدگمانی کا شائبہ پیدا ہوتا ہے، بلکہ ان مصائب و آلام پر بھی اس کا ردِّعمل بالکل وہی ہوتا ہے جو اس مصرعے میں بیان ہوا ہے کہ ع ''ہر چہ ساقئ ما ریخت عین الطاف است'' (میرے ساقی نے میرے پیمانے میں جو بھی ڈال دیا ہے وہ سراسر اس کا لطف وکرم ہے) اس لیے کہ توحید پر ایمان کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ انسان کو یہ یقین ہو کہ جملہ واقعات وحوادث خواہ وہ اس عالمِ اسباب وعِلل کے کتنے ہی طول طویل سلسلے کے نتیجے میں ظہور پذیر ہو رہے ہوں، چونکہ ان جملہ اسباب وعلل کا آخری سرا اللہ کے ہاتھ میں ہے، لہٰذا مسبّبِ حقیقی اور مؤثرِ حقیقی اس کے سوا اور کوئی نہیں۔ لہٰذا ان حوادثِ دُنیوی پر ایک بندۂ مؤمن کا ردِّعمل یہی ہونا چاہیے کہ اگر میرے ربّ کو یہی منظور ہے تو میں بھی اس پر راضی ہوں۔ اسی کو مقامِ تسلیم ورضا کہتے ہیں جس کے بارے میں علامہ اقبال نے کہا ہے: ؎

برون کشید ز پیچاکِ ہست و بود مرا
چہ عقدہ ہا کہ مقامِ رضا کشود مرا

یعنی اس مقامِ رضا نے میرے کیسے کیسے عقدے حل کر دیے کہ میں اس پیچ وتاب سے بالکل نجات پا گیا کہ ایسا کیوں ہے اور ویسا کیوں نہیں ہے، اور یہ کیوں ہوا، وہ کیوں نہ ہوا؟

چنانچہ اسی کا ذکر ہے آیت کے بقیہ حصے میں کہ: ﴿وَمَنْ يُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهٗ ط

وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ﴿۱۱﴾ ''اور جو کوئی اللہ پر ایمان رکھتا ہے اللہ اس کے دل کو ہدایت دیتا ہے' اور اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔'' یعنی جب انسان قلبی ایمان و یقین کے نتیجے میں اس حقیقتِ نفس الامری کا ادراک حاصل کر لیتا ہے کہ اس کائنات اور عالمِ اسباب و علل میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ اذنِ خداوندی سے ہو رہا ہے' تو اللہ اس کے دل کو تسلیم و رضا کی ہدایت بخشتا ہے اور اسے قلبی اطمینان وسکون کی دولت سے نوازتا ہے۔ اور جب انسان اس مقامِ تسلیم و رضا پر پہنچ جاتا ہے تو اس کے احساسات فی الواقع یہ ہو جاتے ہیں کہ مجھے بھی وہی پسند ہے جو میرے ربّ نے میرے لیے پسند کیا ہے' وہ میرا مولیٰ ہے' آقا ہے' پروردگار ہے' خالق و مالک ہے اور مزید برآں میرا خیر خواہ ہے' جو میری مصلحتوں کو مجھ سے زیادہ جاننے والا ہے ـــــ لہٰذا مجھے اس کا ہر فیصلہ بسر و چشم قبول ہے۔ گویا ع

''سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے!''

بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ ؎

نہ شود نصیبِ دشمن کہ شود ہلاکِ تیغت
سرِ دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی!

جب کسی بندۂ مؤمن کے دل میں راضی برضائے ربّ ہونے کی یہ کیفیت پیدا ہو جاتی ہے تو اسے سینکڑوں الجھنوں سے نجات مل جاتی ہے' اور اس کے نہاں خانۂ قلب میں نہ حزن و ملال مستقل طور پر ڈیرہ ڈال سکتے ہیں' نہ حسرتوں کے الاؤ سلگتے ہیں اور نہ ہی اسے گوناگوں قسم کی محرومیوں اور دل شکنیوں کے اس کرب سے سابقہ پیش آتا ہے جو بسا اوقات اختلالِ ذہنی کا سبب بنتا ہے اور اگر شدت اختیار کر جائے تو خودکشی تک پر منتج ہو جاتا ہے۔

۲) اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت

اب آیئے دوسرے رُخ یعنی ان اَفعال و اعمال کی طرف جو ہم سے صادر ہوتے ہیں' اور ان میں سے بھی اصلاً وہ جو ہمارے ارادے کے تابع ہیں۔ اس لیے کہ ہمارے

جسم کے بہت سے اعضاء تو وہ ہیں جو اپنے فطری وظائف از خود ادا کرتے رہتے ہیں اور ان کے فعل میں ہمارے شعور اور ارادے کا دخل نہیں ہوتا۔ ایسے غیر ارادی افعال کے ضمن میں ظاہر ہے کہ ہماری کوئی اخلاقی مسئولیت نہیں ہے۔ لیکن ہماری زندگی کی اصل باگ ڈور جن ارادی اور اختیاری افعال واعمال سے عبارت ہے ان کے ضمن میں ایمان کا جو لازمی نتیجہ نکلنا چاہیے اس میں مقدم ترین شے ہے اطاعت —— یعنی یہ کہ ہمارے اعضاء و جوارح سے کوئی عمل اللہ کے حکم کے خلاف صادر نہ ہو' اس لیے کہ اگر ہم اللہ پر ایمان لانے کے مدّعی ہیں اور ہم نے دلی یقین کے ساتھ اللہ کو مانا ہے تو ہم پر لازم اور واجب ہے کہ ہم کوئی ایسا کام اور کوئی ایسی حرکت نہ کریں جس سے اللہ کا کوئی حکم ٹوٹتا ہو یا اس کی نافرمانی کا ارتکاب ہوتا ہو۔ چنانچہ ہماری زبان سے کوئی ایسا لفظ نہ نکلے جو اللہ کو ناپسند ہو اور ہمارے ہاتھ پاؤں کسی ایسے کام کے لیے حرکت میں نہ آ جائیں جو حکمِ خداوندی کے خلاف ہو۔

پھر معاملہ صرف اللہ کا نہیں بلکہ اس کے رسول حضرت محمد ﷺ کا بھی ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی ہدایت ہر انسان کے پاس براہِ راست نہیں بھیجی۔ اس دنیا میں ہدایتِ ربّانی کا ذریعہ رسول ہوتے ہیں' لہٰذا اللہ کی اطاعت اس کے رسولؐ کے واسطے سے ہی ممکن ہے۔ چنانچہ اطاعت کے باب میں اللہ اور اس کا رسولؐ باہم اس طرح جمع ہیں گویا وہ ایک وحدت ہیں۔ لہٰذا اگلی آیت کے پہلے حصے میں ارشاد ہوا: ﴿وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ۚ﴾ ''اور اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو (اس کے) رسول (ﷺ) کی''۔ گویا مدعیانِ ایمان سے مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ جب تم نے مانا ہے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو تو اس ایمان کا لازمی نتیجہ یہ نکلنا چاہیے کہ تمہارے اعضاء و جوارح سے جو بھی اعمال وافعال صادر ہوں وہ سب کے سب اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کے سانچے میں ڈھلے ہوئے ہوں۔ یہ ایمان کا دوسرا لازمی نتیجہ ہے۔

اطاعت کے حکم کے ساتھ ہی یہ تنبیہہ بھی فرما دی کہ: ﴿فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاِنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ⑫﴾ ''پھر اگر تم نے روگردانی کی (پیٹھ موڑ لی' اعراض کیا) تو

(جان رکھو کہ) ہمارے رسولؐ پر تو صرف صاف صاف پہنچا دینے کی ذمہ داری ہے''۔ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی تعلیمات سے روگردانی اور ان کی تکذیب سے اللہ تعالیٰ کا کچھ نہیں بگڑتا' انسان خود اپنی عاقبت خراب کرتا ہے اور آخرت میں سزا و عذاب کا مستوجب قرار پاتا ہے۔ اسی طرح رسولؐ پر بھی سوائے صاف صاف پہنچا دینے کے اور کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ لہٰذا اگر رسولؐ نے اپنی یہ ذمہ داری پوری کر دی ہے تو وہ آخرت میں سرخرو ہوں گے' اس لیے کہ وہ تمہاری جانب سے جواب دہ نہیں' تمہیں اپنے اعمال و افعال کی خود جواب دہی کرنی ہوگی' اپنے بھلے برے' اپنے نفع و نقصان اور اپنی کامیابی یا ناکامی کے ذمہ دار تم خود ہو گے!

۳) توکل علی اللہ

ہمارے وجود سے صادر ہونے والے افعال و اعمال کا ایک دوسرا رُخ بھی ہے۔ چنانچہ اس کو بھی یہاں واضح کر دیا گیا۔ ارشاد ہوتا ہے: ﴿اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ۝۱۳﴾ ''اللہ ہی وہ ذات ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں' لہٰذا اہل ایمان کو صرف اللہ پر ہی بھروسہ رکھنا چاہیے!'' یعنی ایمان کے نتیجے میں ہمارا سارا بھروسہ' سارا تکیہ' سارا اعتماد اور سارا توکّل اللہ کی ذات پر ہونا چاہیے' اگرچہ ہم اس اسباب و علل کی دنیا میں ساز و سامان اور ذرائع و وسائل سے مستغنی نہیں ہو سکتے اور اپنی امکانی حد تک ہمیں اسباب بھی فراہم کرنے ہوں گے' جیسے ایک دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ ......﴾ (الانفال:٦٠) یعنی اپنے دشمن کے مقابلے کے لیے تیاری کرو اور مقدور بھر جو ساز و سامان فراہم کر سکتے ہو فراہم کرو۔ اور جیسے نبی کریم ﷺ نے تعلیم دی کہ ''پہلے اونٹ کو باندھو' پھر اللہ پر بھروسہ کرو''۔ جس کی بہترین ترجمانی مولانا روم نے اس مصرع میں فرمائی ہے ؏ ''بر توکّل زانوئے اشتر بہ بند!'' چنانچہ اپنی استطاعت کے مطابق دُنیوی اور مادی اسباب اور ساز و سامان فراہم کرنا ایمان کے منافی نہیں ہے' لیکن اگر یہ خیال ہو گیا کہ مجرد اِن اسباب و وسائل اور ساز و سامان سے کام ہو جائے گا' گویا اصل بھروسہ' اعتماد اور تکیہ اپنی محنت' اپنی تیاری اور

اپنے ساز و سامان پر اور اصل توکل مادی اسباب و وسائل پر کیا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ کی ذات سے ہماری نگاہیں ہٹ گئیں اور ہم اس سے محجوب ہو گئے' اس کی کمالِ قدرت کا یقین دل میں قائم نہیں رہا۔ حاصلِ کلام یہ کہ اس عالمِ اسباب میں محنت و کوشش اپنی جگہ ضروری ہے اور امکانی حد تک اسباب و وسائل کی فراہمی اور ان کا استعمال بھی لازمی ہے' لیکن توکّل صرف اور صرف اللہ کی ذات پر ہوگا۔ ان تین آیاتِ مبارکہ میں انفرادی سطح پر ایمان کے ثمرات ونتائج کا بیان مکمل ہو گیا۔

۴) طبعی محبتوں کے ضمن میں احتیاط

انسان اس دنیا میں تنہا نہیں رہتا۔ مدنیت اس کی جبلت اور طبیعت میں رچی بسی ہے۔ لہٰذا وہ اس دنیا میں بہت سے تعلقات میں جکڑا ہوا ہے جن کے کئی دائرے ہیں۔ ایک دائرہ اس کے والدین' بھائی بہن اور بیوی بچوں کا ہے۔ دوسرے دائرے میں رشتہ دار اور اعزّہ و اقارب ہیں۔ پھر کنبے اور قبیلے کا دائرہ اور اس کے بعد قوم کا دائرہ ہے اور بالآخر یہ سلسلہ پوری نوعِ انسانی تک پھیل جاتا ہے۔ ان سب کو ایک لفظ میں جمع کیا جائے تو وہ ہے ''علائقِ دُنیوی''۔ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں تمدن وتہذیب کی گاڑی کو چلانے کے لیے ان علائقِ دُنیوی کے ضمن میں بہت سی فطری محبتیں انسان کے دل میں ڈال دی ہیں۔ انسان کو والدین' بہن بھائیوں' بیوی' اولاد اور رشتہ داروں سے محبت ہوتی ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان محبتوں میں سب سے زیادہ قوی محبت بیویوں اور اولاد کی محبت ہے۔ اس طبعی محبت کی طرف اگلی آیت میں متنبہ فرمایا گیا کہ اگر اس میں حدِّ اعتدال سے تجاوز ہو جائے تو یہی محبت انسان کے لیے دشمنی کا روپ دھار لے گی۔ لہٰذا اس کے ضمن میں احتیاط کی ضرورت ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَاَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ﴾ ''اے اہلِ ایمان! یقیناً تمہاری بیویوں اور تمہاری اولاد میں سے بعض تمہارے دشمن ہیں' پس ان سے ہوشیار رہو!''

یہ انتباہ اس لیے ضروری ہے کہ فی الواقع ان محبتوں میں انسان کے لیے بالقوہ خطرہ موجود ہے' اس لیے کہ اگر آخرت نہ ہوتی اور حساب کتاب نہ ہوتا اور کوئی جواب

دہی نہ ہوتی تب تو کوئی تشویش کی بات نہ ہوتی۔ اس صورت میں تو انسان کو کھلی چھٹی ہوتی کہ بیویوں کی فرمائشیں پوری کرے' خواہ حلال سے کرے' خواہ حرام سے کرے' اولاد کو اچھے سے اچھا کھلائے اور پہنائے اور ان کو اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم دلانے کی فکر کرے' چاہے جائز ذرائع آمدنی سے ہو' چاہے ناجائز ذرائع آمدنی سے ہو—— لیکن جب یہ حقیقت سامنے آچکی ہے کہ یہ زندگی تو بہت عارضی اور مختصر ہے' اصل زندگی تو آخرت کی زندگی ہے جسے کبھی ختم نہیں ہونا اور اصل فیصلے کا دن تو قیامت کا دن ہے' یعنی وہی ہے ہار اور جیت کے فیصلے کا دن! پس اگر اس حقیقت کو جاننے کے بعد بھی تم نے اپنی بیویوں اور اولاد کی محبت سے مغلوب ہو کر اور ان کی خوشنودی کی خاطر اللہ کی حرام کردہ چیزوں میں مُنہ مارا' ناجائز آمدنیوں کا رُخ کیا اور ان کو عیش کرانے اور ان کی فرمائشیں پوری کرنے کے لیے تم نے حلال وحرام کی تمیز کو ختم کر دیا اور جائز و ناجائز کا خیال نہ رکھا تو جان لو کہ یہ تمہارے حق میں محبت نہیں' دشمنی ہے' اور اگر تم محتاط' چوکس اور چوکنے نہ رہے تو یہی بے جا محبت اور لاڈ پیار تمہاری عاقبت کی بربادی کا سبب بن جائے گا۔ چنانچہ نبی اکرم ﷺ کا ارشادِ مبارک ہے کہ: ''بڑا ہی نادان ہے وہ شخص جس نے دوسروں کی دنیا بنانے کے لیے اپنی عاقبت تباہ و برباد کر لی''۔

آیت کے دوسرے حصے میں ارشاد ہوتا ہے: ﴿وَاِنۡ تَعۡفُوۡا وَتَصۡفَحُوۡا وَتَغۡفِرُوۡا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ﴿۱۴﴾﴾ ''اور اگر تم معاف کر دیا کرو اور چشم پوشی سے کام لو اور بخش دیا کرو تو بے شک اللہ بھی بخشنے والا رحم کرنے والا ہے''۔ آیت کے اس حصے میں جہاں فصاحت و بلاغت کا کمال سامنے آتا ہے وہاں صحیح اور معتدل رویّہ اختیار کرنے کی نہایت پُرزور اور مدلّل دعوت بھی سامنے آتی ہے۔ چنانچہ جہاں اس پر زور دیا گیا کہ تمہاری بیویوں اور اولاد میں سے بعض تمہارے حق میں بالقوہ دشمن ہیں' لہٰذا اپنا تحفظ کرو کہ کہیں ان کی محبت تمہیں جادۂ حق سے منحرف نہ کر دے اور تمہاری عاقبت تباہ نہ کرا دے' وہاں دوسری طرف اس کو متوازن کیا گیا کہ ایسا نہ ہو کہ تمہارے مزاج میں خشونت' درشتی اور سختی کا غلبہ ہو جائے اور گھر میدانِ جنگ کا سماں پیش کرنے لگے' اور محبت' شفقت اور نرمی کا

ظہور بالکل نہ ہو۔ لہٰذا اس اعتبار سے تو ضرور چوکس اور چوکنے رہو کہ ان کی محبت کہیں غفلت میں تم سے دین کے خلاف کوئی کام نہ کرا لے' لیکن ان کی صحیح تربیت کے لیے محبت' شفقت اور نرمی لازمی ہے' لہٰذا عفو اور درگزر بھی ضروری ہے!

یہاں غور کیجیے کہ اس عفو و درگزر کے لیے دلیل کیا دی جا رہی ہے! اور پھر اس میں کتنی مؤثر اپیل مضمر ہے!—— یعنی یہ کہ اللہ بھی تو غفور اور رحیم ہے' ذرا سوچو کہ اللہ نے تم کو کتنی ڈھیل دے رکھی ہے۔ اپنے باطن میں جھانک کر دیکھو کہ کتنے مفاسد لیے پھر رہے ہو' لیکن اللہ پھر بھی چشم پوشی کیے ہوئے ہے اور تمہیں مہلت دے رہا ہے اور اس کی ربوبیت اور جُود وسخا کا سلسلہ جاری ہے' لہٰذا تم کو بھی چاہیے کہ اپنی بیویوں اور اولاد کے لیے یہی رویہ اختیار کرو۔

میرے نزدیک یہ آیت قرآن حکیم کے ان خاص مقامات میں سے ہے جہاں ذہنِ انسانی بے اختیار یہ بات تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ یہ اللہ کے سوا کسی اور کا کلام نہیں ہوسکتا' اس لیے کہ یہ توازن اور اعتدال صرف اللہ تعالیٰ ہی کے کلام میں ممکن ہے—— الغرض یہ آیتِ مبارکہ جملہ علائقِ دُنیوی کے ضمن میں ایک بندۂ مؤمن کے زاویۂ نگاہ اور اندازِ فکر کے ساتھ اس کے عملی رویے کو بھی متعین کر دیتی ہے۔ اس لیے کہ جب محبوب ترین علائق کے ضمن میں ہدایت مل گئی تو علائقِ دُنیوی کے دوسرے دائرے تو بہرحال ان کے مقابلے میں ثانوی حیثیت کے حامل ہیں۔

۵) مال اور اولاد فتنہ ہیں!

اس دنیا میں علائقِ دُنیوی کے ساتھ جس دوسری چیز سے انسان بندھا ہوا ہے وہ مال واسبابِ دُنیوی ہیں جن سے انسان کی حیاتِ دُنیوی کی ضروریات پوری ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم میں ایک دوسرے مقام پر (سورۃ النساء: ۵) انہیں حیاتِ دُنیوی کے بقاء اور قیام کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے' لہٰذا ان سے ایک طبعی اور قدرتی لگاؤ بھی انسان کی جبلّت کا جزوِ لاینفک ہے۔ لیکن اگر اس طبعی لگاؤ میں شدت پیدا ہو جائے اور یہ چیزیں فی نفسہٖ محبوب اور مطلوب ومقصود بن جائیں تو آخرت اور عاقبت کے اعتبار سے

ان سے زیادہ مضر اور تباہ کن اور کوئی چیز نہیں ہوتی ـــــ پھر اپنے دُنیوی مستقبل کے لیے انسان جس طرح پس انداز اور جمع شدہ مال پر تکیہ کرتا ہے ایسے ہی اولاد سے بھی امیدیں لگاتا ہے۔ لہٰذا اس مقام پر مال کے ساتھ اولاد کا ذکر دوبارہ کر دیا گیا کہ ہوشیار رہو کہ ان دونوں کی محبت تمہارے حق میں فتنہ ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: ﴿اِنَّمَآ اَمۡوَالُکُمۡ وَاَوۡلَادُکُمۡ فِتۡنَۃٌ ؕ﴾ ''بلاشبہ تمہارے مال اور تمہاری اولاد (تمہارے حق میں) فتنہ ہیں''۔ فتنہ کے لغوی معنی ''کسوٹی'' کے ہیں۔ یعنی وہ چیز جس پر پرکھ کر دیکھا جاتا ہے کہ سونا خالص ہے یا اس میں کھوٹ اور ملاوٹ ہے۔ چنانچہ اہل ایمان کو بتایا جا رہا ہے کہ اس دنیا میں مال اور اولاد تمہارے لیے کسوٹی ہیں، یعنی تمہاری آزمائش کا ذریعہ ہیں اور ان پر تم کو پرکھا جا رہا ہے کہ کہیں تم ان کی محبت سے مغلوب ہو کر اللہ کو بھول تو نہیں جاتے اور اس کے اوامر و نواہی سے بے پروا ہو کر اپنی عاقبت تو خراب نہیں کر لیتے ـــــ!

اس آیت کا اختتام ان الفاظِ مبارکہ پر ہوتا ہے: ﴿وَاللّٰہُ عِنۡدَہٗۤ اَجۡرٌ عَظِیۡمٌ ﴿۱۵﴾﴾ ''اور اللہ ہی کے پاس ہے اجرِ عظیم!'' ـــــ گویا امیدیں وابستہ کرنی ہیں تو اللہ سے کرو، امیدوں کو بر لانے والا، توقعات کو پورا کرنے والا اور تمہاری محنت کی صحیح اجرت دینے والا تو حقیقت میں صرف اللہ ہی ہے۔ لہٰذا اپنی ذاتی صلاحیتوں اور قوتوں کے علاوہ اپنے مال اور اپنی اولاد کو بھی اسی کی راہ میں لگاؤ۔ عام طور پر انسان کی تمام توانائیاں اور اس کا کُل وقت یا زیادہ سے زیادہ وقت مال و دولت جمع کرنے کی خاطر صرف ہوتا ہے یا اولاد پر صرف ہو جاتا ہے، اور انسان توقع کرتا ہے کہ اولاد اس کے بڑھاپے کا سہارا بنے گی۔ جبکہ ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ انسان مال و اسبابِ دُنیوی کو صرف حیاتِ دُنیوی کی ضروریات پوری کرنے کا ذریعہ سمجھے اور اس سے دلی محبت نہ رکھے اور اولاد کی پرورش اور تعلیم و تربیت کو بھی اللہ کی طرف سے عائد شدہ ذمہ داری کی حیثیت سے ادا کرے، نہ کہ طبعی محبت کی بنیاد پر، یا اسے اپنے مستقبل اور بڑھاپے کا سہارا سمجھ کر ـــــ اور اپنی سعی و جہد کا اصل مطلوب و مقصود اللہ کی رضا جوئی اور آخرت کی فلاح کو قرار دے۔

ایمان کے عملی تقاضے

اب ہم اللہ کے نام سے سورۃ التغابن کی آخری تین آیات پر توجہ مرکوز کرتے ہیں۔اس سورۂ مبارکہ کے بارے میں یہ تأثر اس سے قبل بیان کیا جا چکا ہے کہ یہ ''ایمان اور اس کے ثمرات و مقتضیات'' کے موضوع پر قرآن مجید کی جامع ترین سورت ہے۔اس سورت کے مضامین کی ترتیب اس اعتبار سے بڑی حسین ہے کہ اس کے پہلے رکوع میں ایمان کے تینوں اجزاء (ایمان باللہ' ایمان بالرسالت اور ایمان بالآخرت) کی نہایت جامع وضاحت اور ان پر ایمان لانے اور انہیں حرزِ جان بنانے کی زوردار دعوت ہے۔

دوسرا رکوع آٹھ آیات پر مشتمل ہے۔ان میں سے پانچ آیات کا مطالعہ ہم کر چکے ہیں۔ان میں ایمان کے ثمرات اور مضمرات کا نہایت جامع بیان ہمارے سامنے آ چکا ہے۔اس کے بعد تین آیات جن پر یہ سورۂ مبارکہ مکمل ہوتی ہے' ایمان کے عملی تقاضوں کو بالفعل ادا کرنے کی دعوت پر مشتمل ہیں' جنہیں تین اہم اصطلاحات کے حوالے سے بیان کیا گیا ہے۔ یعنی (۱) تقویٰ (۲) سمع و اطاعت اور (۳) انفاق فی سبیل اللہ اور اللہ کو قرضِ حسنہ دینا۔آخر میں مضمون کی مناسبت سے اللہ تعالیٰ کی چند صفاتِ کمال اور اسمائے حسنیٰ کا بیان ہے۔تو آئیے پہلے ان آیات کا متن اور رواں ترجمہ ذہن نشین کر لیں!

﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَاسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوْا وَاَنْفِقُوْا خَيْرًا لِّاَنْفُسِكُمْ ؕ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿١٦﴾ اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعِفْهُ لَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ شَكُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿١٧﴾ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿١٨﴾﴾

''پس اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جتنا تمہارے امکان میں ہو اور سنو اور اطاعت کرو اور خرچ کرو' یہی تمہارے حق میں بہتر ہے' اور جو کوئی اپنے جی کے لالچ سے بچا لیا

> گیا تو وہی ہوں گے جو آخری منزلِ مراد کو پہنچ سکیں گے۔ اگر تم اللہ کو قرضِ حسنہ دو تو وہ اسے تمہارے لیے دوگنا کرتا رہے گا اور تمہاری بخشش فرمائے گا' اور اللہ قدر دان بھی ہے نہایت علم والا بھی ہے۔ وہ کھلے اور چھپے سب کا جاننے والا ہے' زبردست' صاحبِ حکمتِ کاملہ ہے!''

جیسے اس سورۂ مبارکہ کی ابتدائی سات آیات میں ایمان کے بنیادی اجزاء کا بیان تھا اور پھر کلمہ ''ف'' سے پُرزور پیرائے میں دعوتِ ایمانی شروع ہوئی تھی' اسی طرح دوسرے رکوع کی پہلی پانچ آیات میں ایمان کے ثمرات و مضمرات کا بیان تھا اور اب پھر کلمہ ''ف'' ہی سے دعوتِ عمل شروع ہوتی ہے اور اس کے ضمن میں تھوڑا سا غور کرنے پر ایک نہایت حسین ربط نظر آتا ہے کہ ایمانیات میں اوّلین ایمان ہے ایمان باللہ۔ لہٰذا یہاں عمل کی دعوت اس بات سے شروع ہوئی کہ: ﴿فَاتَّقُوا اللّٰہَ مَا اسۡتَطَعۡتُمۡ﴾ ''پس اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جتنا بھی تمہاری حدِ استطاعت میں ہے''—— گویا ایمان باللہ کا عملی تقاضا یہ ہے کہ انسان میں اللہ کا تقویٰ پیدا ہو جائے' اور تقویٰ بھی تھوڑا بہت نہیں' بلکہ امکانی حد تک' مقدور بھر۔ ایمان کے بیان میں دوسرے نمبر پر ذکر تھا ایمان بالرسالت کا' لہٰذا یہاں ایمان کا دوسرا عملی تقاضا بیان ہوا ''سمع و طاعت'' کے حوالے سے' جس کا نقطۂ آغاز عملی اعتبار سے رسول اللہ ﷺ کی ذات و شخصیت ہے۔ آخر میں ذکر تھا ایمان بالآخرت کا' جس کا اہم ترین عملی مظہر انفاق فی سبیل اللہ ہے' لہٰذا تیسرے نمبر پر ذکر ہوا انفاق اور اللہ کو قرضِ حسن دینے کا!

ا) تقویٰ

عام طور پر ''تقویٰ'' کا ترجمہ ''خوف'' یا ''ڈر'' کے الفاظ سے کر دیا جاتا ہے' حالانکہ یہ ''تقویٰ'' کے معنی و مفہوم کی صحیح اور کامل ترجمانی نہیں ہے۔ ڈر یا خوف ایک تو ہوتا ہے کسی خطرناک' خوفناک اور ڈراؤنی شے کا' تو تقویٰ سے یہ ڈر مراد نہیں۔ اور ایک خوف اور ڈر وہ ہوتا ہے جس میں محبت کی آمیزش اور چاشنی بھی موجود ہوتی ہے' یعنی محبت بھرا خوف۔ یہ خوف تقویٰ کی کسی حد تک صحیح ترجمانی ہے۔ بغرضِ تفہیم مثال پیشِ خدمت

ہے کہ جیسے آپ کو اپنے والد سے محبت ہے اور آپ نہیں چاہتے کہ آپ کے والد آپ سے ناراض ہوں یا آپ کے کسی کام سے ان کی دل شکنی ہو یا ان کے جذبات کو ٹھیس پہنچے۔ اس کا منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ آپ کوئی ایسا کام نہیں کرتے جو آپ کے والد کو ناپسند ہو۔ گویا آپ اپنے والد کی ناراضی کے خوف سے اُن کاموں کے ارتکاب سے احتراز کرتے ہیں جو انہیں ناپسند ہوں' پس آپ کے اس محبت بھرے خوف کو ''تقویٰ'' سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ گویا اللہ کا تقویٰ یہ ہے کہ انسان اپنی پوری زندگی میں پھونک پھونک کر قدم رکھے اور اس کے قلب اور ذہن پر ہر وقت یہ خیال مستولی رہے کہ میرے کسی قول اور میرے کسی عمل سے میرا خالق و مالک مجھ سے ناراض نہ ہو جائے' اور اسے ہر وقت یہ فکر دامن گیر رہے کہ کوئی ایسا کام نہ کر بیٹھوں جو میرے ربّ کو پسند نہ ہو۔ یہ کیفیت' یہ طرزِ عمل' یہ رویہ اور یہ اندازِ فکر تقویٰ کی اصل حقیقت ہے!

قرآن حکیم میں سورۂ آل عمران کی آیت ۱۰۲ میں تقویٰ کے ضمن میں یہ شدید تاکید آئی ہے کہ: ﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقٰتِہٖ......﴾ ''اے اہل ایمان! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جتنا کہ اس کے تقویٰ کا حق ہے'' —— روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بڑے ہی مضطرب اور پریشان ہو گئے تھے کہ اللہ کا اتنا تقویٰ جتنا اس کا حق ہے' کون اختیار کر سکتا ہے!! بالکل ایسے جیسے کہ اللہ کی اتنی معرفت حاصل کرنا جتنی کہ اس کا حق ہے' کسی انسان کے بس میں نہیں ہے۔ چنانچہ رسولِ کامل اور عارفِ اعظم حضرت محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود فرماتے ہیں: ((مَا عَبَدْنَاکَ حَقَّ عِبَادَتِکَ وَمَا عَرَفْنَاکَ حَقَّ مَعْرِفَتِکَ)) ''(اے اللہ!) ہم تیری بندگی نہ کر پائے جیسا کہ تیری بندگی کا حق ہے' اور ہم تجھے پہچان نہ سکے جیسا کہ تجھے پہچاننے کا حق ہے''۔ تو اگرچہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں تو یہی گمان ہے کہ یہ کلمات آپؐ نے بر بنائے تواضع ارشاد فرمائے' لیکن کسی بھی دوسرے انسان کے بارے میں تو اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ اللہ کی ''کماحقہٗ'' معرفت کا حصول اس کے دائرۂ اختیار اور حدِّ امکان سے خارج ہے! یہی معاملہ تقویٰ کا ہے۔ اللہ کا اتنا تقویٰ جتنا اس کے تقویٰ کا حق ہے' یہ کسی انسان کے بس

کی بات نہیں ہے' اس لیے کہ اس کا تقاضا تو یہ ہوگا کہ ہم ایک لمحہ کے لیے بھی اللہ کی یاد سے غافل نہ ہوں' اور ہر وقت شعوری طور پر چوکنے اور چوکس رہیں کہ ہمارے اعضاء و جوارح سے کہیں اور کبھی کوئی ایسی حرکت صادر نہ ہونے پائے جو اللہ کے کسی حکم یا منشاء کے خلاف ہو۔ لہٰذا اس پر صحابہؓ کی تشویش بالکل بجا تھی۔ البتہ جب سورۃ التغابن کی یہ آیت نازل ہوئی کہ ﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾ ''پس اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جتنا تمہارے امکان اور حدِّ استطاعت میں ہے'' تب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو تسکین حاصل ہوئی!

واضح رہے کہ یہی بات سورۃ البقرۃ میں بھی ایک قاعدہ کلیہ کے طور پر وارد ہوئی ہے کہ: ﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ؕ﴾ (آیت ۲۸۶) ''اللہ کسی نفس کو مکلّف نہیں ٹھہراتا مگر اُس کی وسعت کے مطابق''۔ اور یہی اصول سورۃ المؤمنون میں بھی وارد ہوا ہے کہ: ﴿وَلَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ (آیت ۶۲) ''اور ہم کسی نفس کو مکلّف نہیں ٹھہراتے مگر اُس کی وسعت کے مطابق''۔ البتہ اس مقام پر تھوڑا سا توقف کر کے استطاعت' استعداد اور وسعت کے بارے میں ایک اصولی بات سمجھ لینی چاہیے اور وہ یہ کہ کسی انسان میں کتنی استطاعت و استعداد اور وسعت و طاقت ہے جس کے مطابق وہ مکلّف اور جواب دہ ہے' اس کا صحیح شعور و ادراک بسا اوقات اسے خود نہیں ہوتا۔ بنا بریں وہ اپنے آپ کو دین کے عملی تقاضوں کے ضمن میں رعایتیں دیتا چلا جاتا ہے اور دین کی جانب سے عائد ہونے والی مشکل اور کٹھن ذمہ داریوں سے خود کو بالکل ہی بری ٹھہرا لیتا ہے' حالانکہ اللہ تعالیٰ جو فاطرِ فطرت ہے' انسان کا خالق ہے اور اس کا علم کامل ہے' وہ خوب جانتا ہے کہ اس نے اس میں کتنی استطاعت' استعداد اور وسعت رکھی ہے۔ چنانچہ وہ ہر انسان کا اسی کے مطابق محاسبہ اور مؤاخذہ فرمائے گا۔ بلکہ اس معاملے میں واقعہ یہ ہے کہ ہم ع ''دیوانہ بکارِ خویش ہشیار!'' کے مصداق اپنے آپ کو دھوکہ دیتے رہتے ہیں کہ جب دین اور نیکی کے کام کی بات ہوتی ہے یا تبلیغ و دعوت کی بات ہوتی ہے یا دین کے دوسرے عملی تقاضے اور مطالبے ادا کرنے کی بات ہوتی ہے تو ہم عذر پیش کر دیتے ہیں کہ ہم میں اس کی استطاعت و استعداد نہیں ہے' جبکہ دنیا کے

معاملات میں ہماری جولانیاں اظہر من الشّمس ہوتی ہیں اور ہماری توانائیوں‘ ہماری تگ ودَو اور ہماری اہلیت وصلاحیت کا نتیجہ بھرپور طور پر سامنے آ رہا ہوتا ہے۔

حقیقت میں یہ ایک فریب ہے جو انسان اپنے آپ کو دیتا ہے۔ اس لیے کہ اگر ایک شخص دنیا میں پھل پھول رہا ہے‘ اس کے جوہر نمایاں ہو رہے ہیں اور وہ دُنیوی امور میں دوسروں سے آگے نکل رہا ہے اور ترقی پر ترقی کرتا چلا جا رہا ہے تو یہ استطاعت و استعداد کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ لامحالہ اس میں ذہانت‘ صلاحیت‘ قوتِ کار‘ وسعتِ عمل اور جذبۂ محنت و مسابقت موجود ہے‘ تب ہی تو وہ آگے سے آگے نکلتا جا رہا ہے۔ لہٰذا صحیح روش اور درست رویہ یہ ہوگا کہ برّ و تقویٰ کے تقاضوں اور دینی ذمہ داریوں کی ادائیگی کے ضمن میں آگے بڑھنے کی شعوری طور پر اور امکان بھر کوشش کی جائے اور اس میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ رہنے دیا جائے اور اپنی امکانی حد تک نہ کوئی تساہل ہو اور نہ ہی کسی فراری ذہنیت کو بروئے کار آنے دیا جائے۔ البتہ یہ بات بالکل ظاہر و باہر ہے کہ اس سب کے باوجود انسان اتنا ہی آگے بڑھ سکے گا جتنی اللہ تعالیٰ نے اس میں استطاعت و وسعت رکھی ہے‘ اگرچہ جب تک انسان اس کے لیے شعوری طور پر عزمِ مصمم کے ساتھ کوشش نہیں کرے گا اُس وقت تک یہ ظاہر ہی نہیں ہو سکے گا کہ اس میں وسعت‘ صلاحیت اور استطاعت کتنی ہے! رہا محاسبۂ اُخروی کا معاملہ تو وہ یقیناً ہر شخص کی وسعت و استطاعت کی بنیاد ہی پر ہوگا جس کا صحیح علم اللہ کو حاصل ہے۔ چنانچہ وہ اسی کے مطابق فیصلہ فرمائے گا کہ کسی شخص نے اس وسعت و استعداد کے مطابق جو اسے دی گئی تھی‘ دین کے مقتضیات و مطالبات پورے کرنے کی کس حد تک محنت اور کوشش کی۔

تقویٰ کے مفہوم کی بہترین تعبیر کے ضمن میں دورِ خلافتِ فاروقیؓ کا ایک بڑا عجیب واقعہ ملتا ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ایک بار اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم کی محفل میں یہ سوال کیا کہ ’’تقویٰ‘‘ کی جامع و مانع تعریف کیا ہے؟ اس کے جواب میں حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ نے جو وضاحت پیش فرمائی اس کا مفہوم یہ ہے کہ:

’’امیر المؤمنین! جب کسی شخص کو جنگل کی ایسی پگڈنڈی سے گزرنے کا اتفاق

ہو جس کے دونوں اطراف میں خاردار جھاڑیاں ہوں تو ایسی پگڈنڈی پر گزرتے وقت وہ شخص لامحالہ اپنے کپڑوں کو ہر طرف سے سمیٹ کر اُس راستہ کو اس طرح طے کرنے کی کوشش کرتا ہے اور سنبھل سنبھل کر پھونک پھونک کر قدم اٹھاتا ہے کہ اس کے کپڑے جھاڑیوں اور کانٹوں سے الجھنے نہ پائیں۔ اس احتیاطی رویّے اور بچ بچ کر چلنے کو ''تقویٰ'' کہتے ہیں۔''

فاروقِ اعظمؓ نے اس تعریف کی تصویب و توثیق فرمائی اور حضرت اُبی بن کعب کو داد دی۔ حقیقت اور امرِ واقعہ یہی ہے کہ اس دنیا میں ہم جو زندگی بسر کر رہے ہیں یہ بھی ایک سفر ہی ہے اور یہاں ہر چہار طرف گناہ' معصیت اور شہوات و لذّات کی نہایت خاردار جھاڑیاں موجود ہیں' چنانچہ ہر ہر قدم پر گناہ کی ترغیب ہے' معصیت کی تحریک ہے اور طرح طرح کے ظلم و اثم اور طغیان و عدوان کی دعوت موجود ہے! اب اگر انسان ان جھاڑیوں سے بچ کر نکل جائے اور اپنے دامن کو اِن میں اُلجھنے نہ دے اور اس دُنیوی سفر کو اس طرح طے کرنے کی کوشش کرے کہ اس کے دامن پر معصیت کا کوئی داغ دھبہ نہ پڑنے پائے تو اس روش' اس رویے اور اس طرزِ عمل کو تقویٰ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ایمان کا اوّلین تقاضا ہے!

۲) سمع و طاعت

تقویٰ کے تاکیدی حکم کے بعد اس آیت میں دوسری بات فرمائی: ﴿وَاسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوْا﴾ ''اور سنو اور اطاعت کرو''۔ اس سمع و طاعت کا تعلق بھی اصلاً تو ایمان باللہ ہی سے ہے' لیکن عملاً اس کا تعلق ایمان بالرسالت سے ہے' اس لیے کہ اگرچہ مطاعِ حقیقی تو اللہ ہی ہے' مگر اللہ کا نمائندہ اور اس کے اِذن سے بالفعل ''مطاع'' بن کر رسول آتا ہے ۔ جیسے سورۃ النساء میں ارشاد فرمایا گیا: ﴿مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ﴾ (آیت ۸۰) ''جس نے رسولؐ کی اطاعت کی درحقیقت اس نے اللہ کی اطاعت کی'' ——— اور: ﴿وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ (آیت ۶۴) ''اور نہیں بھیجا ہم نے کوئی رسول مگر اس لیے کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے''۔ رسول کی یہ

اطاعت اصلاً مطلوب ہے ''سمع و طاعت'' کی شان کے ساتھ' یعنی بلا چون و چرا اور بلا پس و پیش! اس بات کو پورے شعور اور ادراک کے ساتھ سمجھ لینے کی ضرورت ہے کہ ایک اطاعت تو وہ ہوتی ہے جو آپ کے فہم' آپ کی سمجھ اور آپ کی پسند پر منحصر ہے' یعنی یہ کہ اگر کوئی حکم آپ کی سمجھ میں آ گیا یا آپ کو پسند آ گیا تو آپ نے مان لیا اور اطاعت کی روش اختیار کر لی' اور اگر وہ آپ کی سمجھ میں نہیں آیا یا آپ کو اچھا نہ لگا تو آپ نے اطاعت نہیں کی' بلکہ لاپروائی اختیار کی۔ اس رویّے اور طرزِ عمل کا تجزیہ کیجیے تو یہ نتیجہ سامنے آئے گا کہ یہ اطاعت اُس ہستی کی نہیں ہے جو حکم دے رہی ہے' بلکہ اپنی روح اور حقیقت کے اعتبار سے اور عقل و منطق کی رُو سے یہ خود اپنی سمجھ یا اپنے جی کی اطاعت ہے' اور دونوں صورتوں میں آپ نے یا تو اپنی عقل کی' یا اپنے جی کی یا اپنی پسند کی اطاعت کی ہے۔ اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت تو اس شان کے ساتھ مطلوب ہے کہ جو بھی حکم ملے اس پر سرِ تسلیم خم کر دیا جائے' جو فرمان بھی سامنے آئے بجا لایا جائے' جس چیز سے بھی روک دیا جائے اس سے رک جایا جائے! اور اگر ان اوامر و نواہی کی حکمتیں بھی سمجھ میں آ جائیں تب تو کیا ہی کہنے ہیں' یہ تو ''نورٌ علیٰ نور'' والی بات ہے لیکن اگر کسی حکم کی غرض و غایت یا حکمت و مصلحت سمجھ میں نہ آئے تب بھی مجرد ''سمع'' یعنی سن لینے سے ''طاعت'' یعنی فرماں برداری لازم آ جاتی ہے!

عملی اعتبار سے اس ''سمع و طاعت'' کا نقطۂ آغاز نبی ﷺ کی ذات اور شخصیت ہے' اس لیے کہ آپؐ ہی کو وحیٔ جلی کے ذریعے وہ حکمت عطا فرمائی گئی جس کی روشنی میں آپؐ نے اللہ کے کلام کی توضیح و تبیین اپنے فرامین و فرمودات کے ذریعے کی اور اس کا عملی نمونہ اپنی سیرت و کردار اور اپنے افعال و اعمال کے ذریعے پیش فرمایا۔ یہی وجہ ہے کہ آپؐ کے بارے میں وضاحت کر دی گئی کہ: ﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝۳ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝۴﴾ (النجم) ''اور وہ (ہمارے رسولؐ) اپنی خواہش نفس سے نہیں بولتے۔ یہ تو ایک وحی ہے جو (ان پر نازل) کی جا رہی ہے''۔ اسی کی ترجمانی ہے فارسی کے اس شعر میں: ؎

گفتۂ اُو گفتۂ اللہ بود
گرچہ از حلقومِ عبداللہ بود

گویا رسول اللہ ﷺ کے احکام ان کی خواہشات پر مبنی نہیں ہوتے‘ بلکہ اللہ کی وحی پر مبنی ہوتے ہیں۔ تمہارا ذہن‘ تمہارا فکر‘ تمہاری عقل اور تمہاری سوچ محدود ہے۔ ضروری نہیں ہے کہ ہر حکم کی حکمت وعِلّت تمہاری سمجھ میں آ جائے اور ہر حکم کی مصلحت تمہارے فہم کی گرفت میں آ سکے۔ لہٰذا اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت ''سمع وطاعت'' کی شان سے ہوگی‘ اور عقل انسانی کو ہرگز کوئی حق حاصل نہیں ہے کہ اس پر کسی قسم کی حدود و قیود عائد کرے۔ البتہ اللہ کے رسول ﷺ کے بعد کسی مسلمان ہیئتِ اجتماعیہ کے سربراہ‘ یعنی کسی حاکم یا امیر کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ ایسی مطلق اور غیر مشروط اطاعت کا مطالبہ کرے۔ چنانچہ ایسی ہر ''اطاعت'' کے ساتھ ''فی المعروف'' کی قید لازمی ہے۔ یعنی اب ہر اطاعت اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کے دائرے کے اندر اندر ہوگی‘ جیسا کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ((لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوْقٍ فِیْ مَعْصِيَةِ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ))(۱) یعنی مخلوق میں سے کسی کی بھی اطاعت کسی ایسے معاملے میں نہیں کی جا سکتی جس میں خالق کی معصیت لازم آتی ہو۔ البتہ ''فی المعروف'' کی پابندی اور مشاورتِ باہمی کا حق ادا کرنے کے بعد اسلامی معاشرے اور نظمِ جماعت میں درجہ بدرجہ ڈسپلن کی شان ''سمع و طاعت'' والی ہی ہونی چاہیے‘ تاکہ معاشرہ اور ہیئتِ اجتماعی پوری طرح منظّم اور چاق و چوبند رہے۔

۳) انفاق فی سبیل اللہ

زیرِ مطالعہ آیت کی تیسری اور آخری بات کا تعلق ایمان بالآخرت سے ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: ﴿وَاَنْفِقُوْا خَيْرًا لِّاَنْفُسِكُمْ ؕ﴾ ''اور خرچ کرو (اللہ کی راہ میں) اسی میں تمہاری بھلائی مضمر ہے!'' اللہ کی راہ میں خرچ کرنا غرباء‘ فقراء‘ مساکین اور یتامیٰ کے

(۱) سنن الترمذی‘ کتاب الجهاد عن رسول اللہ ﷺ‘ باب ما جاء لا طاعة لمخلوق فی معصية الخالق۔ و مسند احمد۔ (الفاظ مسند احمد کے ہیں۔)

لیے بھی ہے اور اللہ کے دین کے لیے بھی! اس کا ایمان بالآخرت کے ساتھ بڑا گہرا مگر لطیف تعلق ہے‘ اس لیے کہ جسے آخرت پر یقین حاصل ہو وہ جو مال اللہ کے لیے صرف کرے گا اس کے بارے میں اسے یہ اطمینان ہو گا کہ یہ مال محفوظ ہو گیا‘ گویا اللہ کے بینک میں جمع ہو گیا۔ اب یہ بات بالکل ظاہر و باہر اور حتمی و یقینی ہے کہ اگر کسی شخص نے اپنی صلاحیتوں اور توانائیوں کا بیشتر اور بہتر حاصل آخرت کے بینک میں جمع کرا دیا ہو تو ایسے شخص کی کیفیت موت کے وقت بالکل وہی ہو گی جو علامہ اقبال کے اس شعر میں بیان ہوئی ہے: ؎

نشانِ مردِ مؤمن با تو گویم
چو مرگ آید تبسّم بر لبِ اوست

یعنی مردِ مؤمن کی نشانی یہی ہے کہ جب موت کا وقت آتا ہے تو اس کے لبوں پر مسکراہٹ ہوتی ہے۔ اس لیے کہ اسے معلوم ہے کہ میں نے اپنے مال و دولت اور اپنی توانائیوں اور قوتوں کا بہت بڑا حصہ اللہ کے بینک میں جمع کرا رکھا ہے اور اب میں وہاں جا رہا ہوں جہاں میری بچت‘ میری کمائی اور میری توانائیوں کا حاصل جمع ہے۔ اناجیلِ اربعہ کے نام سے اِس وقت جو کتابیں موجود ہیں ان میں سے متی کی انجیل میں حضرت مسیح علیہ السلام کا ایک بڑا پیارا قول ملتا ہے کہ ”اپنا مال زمین پر جمع نہ کرو جہاں کیڑا بھی خراب کرتا ہے اور چوری ڈاکے کا بھی خوف ہے‘ بلکہ آسمان پر جمع کرو جہاں نہ کیڑا خراب کرتا ہے‘ نہ چوری کا خوف ہے‘ نہ ڈاکے کا اندیشہ ہے۔ اور میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جہاں تمہارا مال ہو گا وہیں تمہارا دل بھی ہو گا“۔ اس ضمن میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا ایک واقعہ بھی بڑا عجیب اور پیارا ہے۔ ان کے یہاں ایک بکری ذبح ہوئی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دستی کا گوشت بہت مرغوب تھا تو سیدہ صدیقہؓ نے ایک دستی بچا کر رکھ لی اور باقی سارا گوشت غرباء و مساکین میں تقسیم کر دیا۔ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو آپؐ نے دریافت فرمایا: ((مَا بَقِیَ مِنْھَا؟)) ”اس بکری میں سے کیا بچا؟“ حضرت عائشہ صدیقہؓ نے عرض کیا: مَا بَقِیَ مِنْھَا اِلَّا کَتِفُھَا ”اس میں سے کچھ نہیں بچا سوائے ایک دستی کے“۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

ارشاد فرمایا: ((بَقِیَ کُلُّھَا غَیْرَ کَتِفِھَا))[1] ''پوری بکری بچ گئی سوائے اس دستی کے!''یعنی اس دستی کو تو ہم کھالیں گے اور جو کھالیا گیا وہ تو خرچ ہوگیا' البتہ جو اللہ کی راہ میں دے دیا گیا وہ باقی رہنے والا ہے' وہ اصل بچت ہے۔ لہٰذا ایمان بالآخرت کے نتیجے میں انسان کے نقطۂ نظر میں یہ تبدیلی آنی چاہیے کہ جو کچھ اللہ کی راہ میں دے دیا ہے وہ حقیقی بچت ہے۔ یہی تعلیم و تلقین ہے ان الفاظِ مبارکہ میں کہ: ﴿وَاَنْفِقُوْا خَیْرًا لِّاَنْفُسِکُمْ ؕ﴾ ''اور اللہ کی راہ میں خرچ کرو' یہی تمہارے لیے بہتر ہے''۔

آگے متنبہ فرمادیا کہ اگر مال کی محبت تمہارے دل میں باقی رہی اور تمہیں اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے روکتی رہی تو یہ بخل ہے۔ ﴿وَمَنْ یُّوْقَ شُحَّ نَفْسِہٖ﴾ یعنی ''جو اس شُحّ سے' بخل سے' اپنے جی کے لالچ سے بچالیا گیا'' وہی انفاق میں آگے بڑھ سکے گا' اور اس صورت میں وہ کامیابی و کامرانی اور فوز و فلاح سے ہمکنار ہو سکے گا۔ چنانچہ آیتِ مبارکہ کا اختتام ہوتا ہے ان الفاظِ مبارکہ پر: ﴿فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۱۶﴾﴾ ''پس یہی لوگ ہیں فلاح پانے والے''۔ فلاح کسی کے منزلِ مقصود پر پہنچ جانے کو کہتے ہیں۔ تو یہاں واضح فرمادیا گیا کہ جو اس شُحِّ نفس سے' مال کی محبت اور جی کے لالچ سے بچالیا گیا وہی آخری منزلِ مراد تک رسائی حاصل کر سکے گا!!

اگلی آیت میں انفاق پر ایک نہایت مؤثر اسلوب سے مزید زور دیا جا رہا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: ﴿اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا یُّضٰعِفْہُ لَکُمْ وَیَغْفِرْ لَکُمْ ؕ﴾ ''اگر تم اللہ کو قرضِ حسن دو تو وہ اسے تمہارے لیے دوگنا کرتا رہے گا اور تمہاری بخشش فرمائے گا''۔ اللہ کی راہ میں اگر انفاق کیا جائے' خرچ کیا جائے' مال لگایا اور کھپایا جائے تو اسے اللہ تعالیٰ ہماری حوصلہ افزائی اور قدر دانی کے لیے اپنے ذمے قرض سے تعبیر فرماتا ہے۔ واضح رہے کہ اللہ کی رضا کے لیے مال خرچ کرنے کی دو مدّات ہیں' ایک مدّ یہ ہے کہ اللہ کی مخلوق میں سے جو صاحبِ احتیاج ہیں' یعنی غرباء و فقراء' یتامیٰ و مساکین' بیوائیں اور ایسے لوگ جو کسی سبب سے معاشی جدّ و جہد میں پیچھے رہ گئے ہیں ان کی مدد کی جائے'

---

(۱) سنن الترمذی' کتاب صفة القیامة والرقائق والورع عن رسول اللّٰہ ﷺ' باب منه۔

اور دوسری مدّ یہ ہے کہ اللہ کے دین کی نصرت کے لیے خرچ کیا جائے۔ یعنی اس کے دین کی نشر و اشاعت اور دعوت کے لیے صرف کیا جائے اور دین حق کے غلبہ اور اقامت اور جہاد و قتال فی سبیل اللہ کی ضروریات کی فراہمی پر صرف کیا جائے۔

اگرچہ قرآن مجید میں اکثر و بیشتر مقامات پر ان دونوں مدّات کا ذکر مشترک انداز میں آتا ہے' لیکن جا بجا ان کے لیے علیحدہ اصطلاحات بھی استعمال ہوتی ہیں۔ چنانچہ پہلی مدّ کے لیے بالعموم ''ایتاءِ مال'' اور ''صدقہ'' کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے اور دوسری مدّ کے لیے عموماً ''جہاد بالمال'' اور ''انفاق فی سبیل اللہ'' کی اصطلاحات اختیار کی جاتی ہیں' جیسے قرآن مجید میں متعدد مقامات پر اس طرح کے الفاظ آتے ہیں: ﴿وَجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ ''اور جہاد کرو اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں''۔ اور اسی کو اللہ تعالیٰ اپنے ذمے قرض سے بھی تعبیر فرماتا ہے' حالانکہ اس کائنات میں جو کچھ بھی ہے وہ اللہ ہی کا ہے' جیسے کہیں فرمایا: ﴿وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط﴾ (الحدید: ۱) ''اور آسمانوں اور زمین کی وراثت اللہ ہی کے لیے ہے''۔ اور کہیں ارشاد ہوا: ﴿وَلِلّٰهِ خَزَآئِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ (المنٰفقون: ۷) ''اور آسمانوں اور زمین کے جملہ خزانے اللہ ہی کے لیے ہیں''۔ لیکن جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا' اللہ تعالیٰ اپنی راہ میں ہمارے اس انفاق کو اپنی قدر دانی کے اظہار اور حوصلہ افزائی کے لیے اپنے ذمہ قرضِ حسن قرار دیتا ہے۔ پھر دنیا کے قرضِ حسن میں تو صرف رأس المال کے واپس ملنے کی امید ہوتی ہے اور کسی اضافے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا' اس لیے کہ یہاں قرض پر اضافہ سود ہے جو ہمارے دین میں مطلقاً حرام ہے' لیکن انفاق کی شکل میں اللہ تعالیٰ کو جو قرضِ حسن دیا جاتا ہے اس کے بارے میں وہ وعدہ فرماتا ہے کہ وہ اسے بڑھاتا رہے گا اور اس میں اضافہ کرتا رہے گا۔ مزید برآں اس کی برکت سے تمہاری مغفرت فرمائے گا۔

اس آیت کے اختتام پر اللہ تعالیٰ کی صفات کا ایک نہایت حسین و جمیل جوڑا آیا ہے اور اس میں قرآن کے عام اسلوب کے مطابق نہایت گہرا معنوی ربط ہے۔ ارشاد

فرمایا: ﴿وَاللّٰہُ شَکُوۡرٌ حَلِیۡمٌ ﴿۱۷﴾﴾ ''اور اللہ شکور (یعنی قدر دان) بھی ہے' حلیم (یعنی بردبار) بھی''۔ یعنی اگر تم اللہ کی راہ میں انفاق کرتے ہو' خرچ کرتے ہو تو وہ قدر افزائی فرمانے والا ہے' اور اس کے برعکس اگر بخل کرتے ہو' نفس کے شُحّ اور جی کے لالچ ہی میں مبتلا رہتے ہو اور اسی کا عطا کردہ مال اس کی راہ میں خرچ نہیں کرتے' بلکہ مال کو سینت سینت کر رکھتے ہو تب بھی وہ فوراً گرفت نہیں فرماتا' بلکہ ڈھیل دیتا ہے' کیونکہ وہ بڑا حلیم اور بڑا بُردبار ہے۔

اس سورۂ مبارکہ کی آخری آیت بھی بڑی عجیب اور بہت پیاری ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: ﴿عٰلِمُ الۡغَیۡبِ وَالشَّہَادَۃِ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ ﴿۱۸﴾﴾ ''(وہ اللہ) چھپے اور کھلے سب کا جاننے والا ہے' زبردست ہے' کمالِ حکمت والا ہے!'' آیت کے آخر میں پھر دو اسمائے حسنیٰ جوڑے کی صورت میں آئے ہیں' یعنی وہ ''العزیز'' بھی ہے اور ''الحکیم'' بھی۔ گویا ایک جانب اللہ غالب ہے' زبردست ہے' مختارِ مطلق ہے' اس کے اختیارات پر کوئی تحدید نہیں ہے' لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ الحکیم بھی ہے' چنانچہ وہ جو کچھ کرتا ہے حکمت کے ساتھ کرتا ہے۔ پھر دیکھئے یہاں صفات و اسماء کے دو جوڑوں یعنی ''شَکُوۡرٌ حَلِیۡمٌ'' اور ''الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ'' کے درمیان اللہ تعالیٰ کی صفتِ علم کا بیان ایک نئی شان کے ساتھ آ گیا۔ یعنی وہ غائب و حاضر' چھپے اور کھلے سب کا جاننے والا ہے۔ اس میں ایک جانب اہل ایمان' اصحابِ برّ وتقویٰ اور طاعت و انفاق پر کاربند رہنے والوں کے لیے بشارت اور یقین دہانی مضمر ہے کہ وہ مطمئن رہیں کہ ان کی کوئی نیکی ضائع جانے والی نہیں ہے اور دوسری طرف اعراض و انکار کی روش اختیار کرنے والوں کے لیے تہدید و تنبیہہ بھی ہے کہ تمہاری کوئی حرکت اللہ سے پوشیدہ نہیں ہے اور وہ تمہیں کیفرِ کردار تک پہنچانے کے لیے کامل غلبہ واقتدار کا مالک ہے! اس لیے کہ وہ ''العزیز'' ہے۔ اور اگر وہ تمہاری گرفت فوری طور پر نہیں کر رہا بلکہ تمہیں مہلت اور ڈھیل دیے جا رہا ہے تو یہ اس کی حکمتِ کاملہ کا مظہر ہے' اس لیے کہ جہاں وہ ''العزیز'' ہے وہاں ''الحکیم'' بھی ہے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العالمین ○○